مشراق

رفیق راز

زیرِ اہتمام

تحریکِ ادب وارنی

رفیق راز ہمارے عہد کے ان
شاعروں میں ہیں جن کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ
انہوں نے اپنے تخلیقی عمل میں کسی خاص تحریکی یا
رجحانی عناصر کو اہمیت نہیں دی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ
ان کا بیشتر کلام ''شب خون'' میں شائع ہوا ہے اس
لیے ان کو نظریاتی جوش کے زیر اثر خالص جدیدیہ یا
شب خونی طرز عمل کا شاعر بھی کہا جاسکتا ہے لیکن
پھر ان صوفیانہ موضوعات کا کیا بنے گا جو ریاست
جموں کشمیر کے سب سے متنوع اور کبھی نہ ختم ہونے
والے موضوعات ہیں اور جن کا ذکر رفیق راز کی
غزلوں میں بکھرا پڑا ہے۔ یہ اور اس قسم کے متعدد
دلائل رفیق راز کے پہلے مجموعۂ کلام ''انہار'' میں بھی
موجود تھے اور ''مشراق'' میں انہوں نے اس سلسلے کو
آگے بڑھایا ہے۔ ''مشراق'' میں شامل غزلوں کی
جو سب سے اہم خصوصیت مجھے نظر آئی وہ یہ کہ ان
کے بعض اشعار جو تصوف بالخصوص وادیٔ کشمیر کی
مستحکم روایت کو ایک طرح سے زندہ کر دیتے ہیں،
اگر کوئی روایت پرست محض ان اشعار کے آئینے
میں رفیق راز کی شعری قدر کا تعین کرے گا تو اولاً
صوفی شاعر قرار دے گا۔

مشراق

رفیق راز

زیر اہتمام
تحریک ادب

نام کتاب: مشراق

مصنف: رفیق راز

Mishraq

by **"Rafiq Raaz"**

Price 500/- only

پتہ: آئی۔جی۔روڈ، باغات سرینگر، کشمیر

ضخامت: ۲۱۶ صفحات

طباعت: تحریک ادب، وارانسی

کمپوزنگ: ضمیر اندرابی، سرینگر، کشمیر

سرورق اور ترتیب: عظمیٰ اسکرین، وارانسی Mob.: 9369138837

e-mail: uzmascreen_vns@yahoo.com

سن اشاعت: دسمبر ۲۰۰۹ء

تعداد: ۶۰۰

قیمت: ۵۰۰/روپئے

تقسیم کار:

جاوید انور

Urdu Ashiana

167, Afaq Khan Ka Ahata, Manduadeeh Bazar

Varanasi-221103 (U.P.) India

Mob.: 0091-993-595-7330

e-mail: jaweanwar@gmail.com

عالم از نالۂ عشاق مبادا خالی
کہ خوش آہنگ و فرح بخش نوائے دارد

حافظ شیرازی

انتساب

عصرِ حاضر کی دو مکرم و محترم شخصیات

جناب شمس الرحمٰن فاروقی صاحب

اور

جناب گوپی چند نارنگ صاحب

کے نام

☆ جن کی بدولت عصرِ حاضر کا اردو ادب جمود کا شکار ہونے سے محفوظ رہا۔

☆ جن کی بدولت اردو رسائل اور جرائد کے دل زور زور سے دھڑکتے ہیں۔

☆ جن کی بدولت ہمارے عہد میں دریائے ادب طغیانی پر رہا۔

نکتۂ روح فزا از دہن یار بگوے

نامۂ خوش خبر از عالم اسرار بیار

حافظ شیرازی

حرفے چند

"مشراق "میرا دوسرا مجموعہ کلام ہے۔ میرا پہلا مجموعہ "انہار" ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا تھا۔ میری شاعری کا آغاز یوں تو ۷۴، ۷۵ء کے آس پاس ہوا تھا اس لحاظ سے میرا پہلا شعری مجموعہ کافی پہلے شایع ہونا چاہئے تھا۔ لیکن ایسا کچھ تو کشمیر کے نامساعد حالات اور کچھ میری تساہل پسندی کی وجہ سے نہ ہوسکا۔ میرے پہلے مجموعے کی کمپوزنگ تو ۲۰۰۰ء میں ہی مکمل ہو چکی تھی۔ اس کے چار سال بعد اسے پریس میں بھیجا گیا۔

میرے دوسرے مجموعہ "مشراق" میں پچھلے نو دس برسوں میں لکھی گئی غزلیں شامل ہیں۔ ان میں اکثر غزلیں مختلف رسائل میں چھپ چکی ہیں پھر بھی یہ تمام غزلیں شاید کتابی صورت میں اتنی جلد شائع نہ ہوتیں اگر جناب جاوید انور (تحریک ادب والے) سے سری نگر میں میری ملاقات نہ ہوتی۔ ایک دو ملاقاتوں میں ہی اندازہ ہوا کہ وہ نہ صرف اردو کیلئے دل میں درد رکھتے ہیں بلکہ اس کیلئے عملی کوششیں بھی کرتے ہیں۔

میں نے ان کو کافی مخلص پایا، ان کے خلوص کے آگے میں نے سپر ڈال دیئے اور میں اپنا دوسرا شعری مجموعہ "مشراق" کی اشاعت کیلئے تیار ہوگیا۔ چنانچہ میں نے اپنی غزلوں کا مسودہ ان کے حوالے کیا۔ انہوں نے جس طرح مناسب سمجھا اسے طباعت سے آراستہ کیا جس کیلئے میں ان کا ممنون ہوں۔

اس مجموعے میں اگر کوئی خوبی ہے تو وہ انکی وجہ سے ہے اور اگر کوئی خامی رہ گئی ہے تو اس کیلئے میں خود ذمہ دار ہوں۔ یہاں یہ کہنا ضروری ہے کہ میں بنیادی طور پر کشمیری زبان کا شاعر ہوں۔ گو میں اردو میں بھی طبع آزمائی شروع سے ہی کرتا رہا لیکن میری تمام تر توجہ کشمیری شاعری پر ہی مرکوز رہی۔ اردو میں شعر گوئی کا سلسلہ شاید میں جاری نہ رکھتا اگر جناب شمس الرحمٰن فاروقی کی بے پناہ شفقت اور حوصلہ افزائی مجھے نصیب نہ ہوتی۔ انہوں نے میری غزلوں کو ازراہ شفقت مسلسل اور اہتمام کے ساتھ "شب خون" میں شائع فرما کے مجھے اردو کے ساتھ باندھے رکھا۔ یہ انکی بے پناہ عنایتوں کا نتیجہ ہی ہے کہ میں آج اردو میں زیادہ اور کشمیری میں بہت کم شعر کہتا ہوں۔

آج کل کے اردو رسائل کی ورق گردانی کرتے ہی لگتا ہے کہ ادبی فضا کافی آلودہ ہو چکی ہے۔ اردو کی دو نابغۂ روزگار شخصیات یعنی جناب شمس الرحمٰن فاروقی اور جناب گوپی چند نارنگ پر کافی کیچڑ اچھالی جاتی

ہے جس سے میرا دل کافی آزردہ ہے۔ یہ دونوں شخصیات مکرم و محترم ہیں۔ ان کے کام سے ہی ان کے قد کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ میں اس بات پر فخر محسوس کرتا ہوں کہ میں اسی عہد میں سانس لے رہا ہوں جس میں یہ دونوں قد آور شخصیتیں اپنے پورے قد کے ساتھ کھڑے ہیں۔ صرف اسی بات کے پیش نظر میں اپنا یہ مجموعہ کلام ان دونوں حضرات کے نام اس امید کے ساتھ معنون کرتا ہوں کہ جو کدورتیں دلوں میں ہیں وہ دور ہوجائیں گی اور اردو ادب کا آلودہ مطلع صاف ہوجائے گا۔

معیشت ہم فقیروں کی سی اخوانِ زماں سے کر
کوئی گالی بھی دے تو کہہ بھلا بھائی بھلا ہوگا

(میرؔ)

اردو ادب میں نہ میری کوئی ایسی حیثیت ہے اور نہ یہ مجموعہ کلام ان دو حضرات کے نام معنون کرنے سے ان کی قدر و منزلت میں کوئی اضافہ ہوگا البتہ میری عزت و توقیر میں ضرور اضافہ ہوگا۔



☆☆☆

معجز است این شعر یا سحرِ حلال
ہاتف آورد این سخن یا جبرئیل

حافظ شیرازی

نعت

نسلِ آدم کی زمیں پر ہے بقا تم سے ہی
کرہَ ارض پہ رقصاں یہ ہوا تم سے ہی

میں معطر ہوں ترے اسم ہی کی خوشبو سے
اور میں خلق میں سب سے ہوں جدا تم سے ہی

سارے نبیوں میں فقط افضل و برتر ہو تمہیں
تم خدا سے ہو مگر خود ہے خدا تم سے ہی

قبلہ رو تجھ سے ہوئے جن و بشر دھرتی پر
قاف تا قاف اذانوں کی صدا تم سے ہی

زندگی میں جو اجالا ہے تری ذات سے ہے
غم کے ظلمات میں روشن ہے دیا تم سے ہی

نطق کو طرز تکلم ترے دم سے ہی ملی
عجمی مجھ سا ہوا نغمہ سرا تم سے ہی

تمام شہر تھا جنگل سا اینٹ پتھر کا
غضب وہ دیکھ کے آیا ہوں بادِ صرصر کا

صدائیں چشمہ ابلنے کی آرہی ہیں مجھے
کسی نے توڑ دیا کیا سکوت پتھر کا

ملا ہے خاک نشینی سے یہ مقام مجھے
زمیں ہے تخت فلک تاج ہے مرے سر کا

مجھے تو کوئی بھی موسم اڑا نہیں سکتا
کہ میں تو رنگ ہوں اس کے ادھورے منظر کا

رواں کیا ہے مجھے کن بلندیوں کی طرف
کہ آسمان بھی لگتا ہے سایہ شہپر کا

میں اپنا گھر تو جلا کے سفر پہ نکلا تھا
خیال دشت میں آیا فقط ترے در کا

سنائی دیتی نہیں ہے اب اپنی آہٹ بھی
رواں ہوا ہے ہر اک سمت شور اندر کا

جب آفتاب سا مجھ پر ہوا تھا روشن تو
مجھے ہے یاد وہ یخ بستہ دن دسمبر کا

ہوائے لمس میں اک آگ بھی تھی پوشیدہ
کہ تابناک ہوا جسم سنگ مرمر کا

زہے نصیب محمدؐ کا نام لیوا ہوں
ہے لاکھ شکر خدائے بزرگ و برتر کا

رنگوں سے ٹھنڈے پانی کے چشمے بنا دیئے
کاغذ پہ سایہ دار شجر بھی لگا دیئے

لاؤں گا اب کہاں سے نظارے کی تاب میں
اس نے تو میری آنکھ سے پردے ہٹا دیئے

باغ حروف و گلشن معنی میں دیکھنا
کس نے یہ خامشی کے نئے گل کھلا دیئے

چھوٹے سے ابر پارے نے آکے سر فلک
اہل نظر کو دن ڈھلے پیغام کیا دیئے

بس ہم تو ایک چھوٹی سی ضد پر اڑے رہے
دستار کو بچانے میں سر ہی کٹا دیئے

آنکھوں میں رہ گئے ہیں فقط آس کے سراب
دریا وہ یاس کے تھے جو ان میں بہا دیئے

دن کو سفر کچھ اور بھی آسان ہوگیا
راتوں کو سبز خواب یہ کس نے دکھا دیئے

ترتیب سے لئے ہیں تمہارے تمام نام
اک اور ہی فلک پہ ستارے سجا دیئے

طوفاں کا روپ دھار لیا تیز سانس نے
اتنا کہ خواب گاہ کے پردے ہلا دیئے

اے دل زار کہیں نیند نہ ہو طاری
چشم درویش بھی خوابوں سے نہیں عاری

جسم کا دشت بھی سنسان ہے برسوں سے
ملک دل پر بھی نہیں روح کی سرداری

چاند سے کم نہ تھی ہم ہجر کے ماروں کو
اس شب تار میں موہوم سی چنگاری

یک بیک کون مری فکر میں در آیا
نہر خوشبو سی بیاباں میں ہوئی جاری

راکھ کے ڈھیر میں شعلہ ہے کوئی رقصاں
میرے اندر ہے ابھی تک کوئی انکاری

زلف پیچاں تری زنجیر بنے گی کب
کب عمل میں مری آئے گی گرفتاری

اے ہوائے دیار درد و ملال
مرحبا، مرحبا، تعال، تعال

لفظ گم سم ہیں اور ان میں ہے گم
میری خاموشیوں کا جاہ و جلال

عقل سے کسب روشنی کر کے
ملک دل ہوگیا ہے روبہ زوال

تو بھی اس میں ہے تیری دنیا بھی
کتنا گہرا ہے سوچ کا پاتال

پکی سڑکوں پہ یاد آتا ہے
کچے رستوں کا سبزۂ پامال

کس پہ اب ہے چنار کا سایہ
این جیرانِنا و کیف الحال ؎۲

کھول دیوان حافظِ شیراز
فال تو اب رفیقِ راز نکال

؎۱ مرحبا مرحبا آجا آجا۔ یہ مصرع حافظ شیرازی کا ہے۔
؎۲ ہمارے پڑوسی کہاں ہیں اور کیا حال ہے؟ یہ مصرع بھی حافظ شیرازی کا ہے۔

کھینچ لائی تھی مجھے خوشبو ہی تیرے پیرہن کی
پر تری آنکھوں میں ہے وحشت بھی آہوے ختن کی

عشق کی آتش کہاں بارود کے شعلے ہیں رقصاں
اب کہاں وہ زلف اور وہ داستاں دارو رسن کی

کیا ہوئے وہ دن کہ جب اکثر میسر تھی مجھے بھی
دن کو ظلمت زلف کی اور دھوپ شب کو سیم تن کی

آتش فرقت سے میں شب کو اجالا مانگتا ہوں
عشق میں ہوتی نہیں ہے حد کوئی دیوانہ پن کی

روشنی جس کی مری آنکھوں کو خیرہ کر چکی ہے
راکھ کر کے چھوڑ دے گی اب حرارت اس بدن کی

دیکھ کے رستے کے منظر سب کے سب تھے غرق حیرت
یاد ایسے میں بھلا آتی کسے اپنے وطن کی

ہر سمت پھیلا ہوا ہے دھواں سا
روشن ہے کچھ کرب آوارگاں سا

دیوار و در پر ہیں جلوے اسی کے
میرا مکاں بھی ہوا لامکاں سا

پاؤں کے نیچے تو دھرتی نہیں ہے
سر پر ہے موجود اک آسماں سا

چلتا رہے تو ہے اک موج طوفاں
رک جائے تو ایک سرو رواں سا

آغاز بھی وہ ہے انجام بھی وہ
یعنی مکمل ہے وہ داستاں سا

دشت و جبل بھی ہیں خورشید و مہ بھی
خوابوں کا عالم ہے تیرے جہاں سا

رہتا ہوں پہروں میں اس کی ہی دھن میں
آنکھوں سے یارب وہ کیوں ہے نہاں سا

مڑکر نہ دیکھوں نہ رک کر ہی سوچوں
بے سدھ ہوں تیری ہی جانب رواں سا

خشک لب لوگ صف آرا ہوئے ہیں پانی پر
آگ برسے گی اب اس خطۂ بارانی پر

آسماں سر پہ اٹھائے ہوئے تھے سناٹے
اور دریائے خموشی بھی تھا طغیانی پر

میرا دامن کوئی تپتا ہوا صحرا نکلا
ناز بے کار تھا اشکوں کی فراوانی پر

سوچ کی شمع جلائی ہی نہیں اس ڈر سے
حرف آئے نہ کہیں رات کی سلطانی پر

پیاس میری بھی بجھاتے ہیں پہاڑی جھرنے
ورنہ مامور ہیں یہ تیری ثنا خوانی پر

آنکھ لگتی ہی نہیں اب کسی صورت یارب
بس کہ حیراں ہے بہت خواب کی ارزانی پر

کتنے شب زاد اجالوں میں نہایا ہوا ہے
نظریں ٹکتی ہی نہیں چہرۂ نورانی پر

جا بجا سبزہ اُگ آیا ہے بڑی دیر کے بعد
کس کے آنسو یہ گرے دشت کی ویرانی پر

اتنے مشکل بھی نہیں شعر مرے غور تو کر
پردہ ابہام کا ہے فکر کی عریانی پر

خالی ہاتھوں دیارِ فکر میں آ
لعل و گوہر سمیٹ کر لے جا

جایزہ لے رہا ہے کھیتوں کا
کس بلندی سے ابر کا ٹکڑا

خطۂ روح بھی نہ راس آیا
کچھ شرر بار تھی یہاں کی ہوا

آسمان مزاج عالی پر
چھا گیا ہے سیاہ ابر انا

ایک محشر لئے ہوئے ہوں میں
میری چپ میں ہے شور ارض و سما

خاک اڑاتے نہیں ہیں خاک نشیں
خاک ہوتے ہیں اہل فقر و فنا

ہم کہ حیرت زدہ تھے سائے میں
پیڑ سارے تھے محو حمد و ثنا

تو اکیلا ہی خوب لگتا ہے
میں تو بے چین ہوں تمہارے بنا

بحر معنی اگر رواں کر دوں
کم پڑیں گے یہ لفظ کے صحرا

مطمئن ہے یہ ذرۂ کشمیر
ہے پریشاں ہوائے حرص و ہوا

چھیڑا ہے نیا نغمہ حیات ابدی نے
اس بار تبسم نہ کیا سن کے کلی نے

لفظوں میں اترنے کا ہنر سیکھ رہا ہوں
خطرے میں ہیں الفاظ کے سینوں میں دفینے

وہ ہیں کہ بھٹکتے ہیں ابھی پیاس کے مارے
ہم ہیں کہ ڈبو آئے سرابوں میں سفینے

سنتا ہوں تڑپتے ہوئے پانی کا فقط شور
حساس بنایا ہے مجھے تشنہ لبی نے

افلاک کے منظر ہیں مرے سامنے عریاں
بخشی یہ بلندی مجھے بے بال و پری نے

شاداب نظر آتے ہیں اشجار ہر اک سمت
کیا شہر میں جنگل کی ہوا لائی کسی نے

پہلو میں دھڑکتا ہے تڑپتا ہے شب و روز
بے چین کیے رکھا ہے مجھ کو مرے جی نے

جو راستے جاتے ہیں ترے عرش کی جانب
وہ رستے بھی دکھلائے مجھے دربدری نے

دعا قبول ہوئی بادشہ سلامت کی
عدو کی فوج کے سالار نے بغاوت کی

مرے بدن میں رواں دجلہ و فرات بھی تھے
مگر لبوں پہ مرے پیاس تھی قیامت کی

تمام نخل ثمر دار اکھڑ گئے جڑ سے
یہاں سے موسم راحت فزا نے ہجرت کی

ہمارے شعر میں آباد ہے جہان طلسم
ہماری طرز میں اک شان ہے روایت کی

میں کتنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈ سکتا ہوں
طویل ہوتی ہے کتنی یہ رات فرقت کی

ہماری روح میں نشہ ہے تیرے جلوؤں کا
ہمارے آنکھوں میں ہے روشنی بھی حیرت کی

پریشاں تھا ہواؤں سے جواں ہونے سے پہلے
زمیں پر گرد تھا میں آسماں ہونے سے پہلے

سکوت فکر تھا میں تھا مری تنہائیاں تھیں
سبھی کچھ تھا تری جانب رواں ہونے سے پہلے

بس اک لفظوں کی تاریکی نے آگھیرا ہے مجھ کو
کہ میں صد رنگ معنی تھا بیاں ہونے سے پہلے

بلاد جاں کا ہر ذرہ منور تھا اسی سے
وہ مشل شعلہ تھا دل میں دھواں ہونے سے پہلے

مجھے میری بصیرت چین سے رہنے نہ دے گی
زیاں کا خدشہ رہتا ہے زیاں ہونے سے پہلے

کھلے ہیں اس پہ سب اسرار میرے رفتہ رفتہ
وہ کتنا بدگماں تھا مہرباں ہونے سے پہلے

بھٹکتا ابر پارہ تھا میں تیری جستجو میں
زمینوں پر برس کر نغمہ خواں ہونے سے پہلے

اذن سفر ملا نہ مسافر کو دیر تک
مایوس ہو کے رات گئے سو گئی سڑک

اب کے لرز اٹھیں گے تمنا کے پیڑ بھی
اب کے ہوائے فکر در آئی ہے بے دھڑک

آیا بہم نہ صفحۂ افلاک ہی مجھے
ظاہر ہوئی نہ میرے خیالات کی دھنک

گل ہے نہ گلستاں ہے نہ لالہ نہ لالہ رو
پھیلی ہوئی ہے کیسی نہ ہونے کی یہ مہک

کیا غم اگرچہ پاؤں کے نیچے زمیں نہیں
سر پر تنا ہوا تو ہے امید کا فلک

ہے کس فقیر کی یہ خموشی شباب پر
جنگل میں ہر طرف ہے پر اسرار سی چمک

روشن ہوئے نہ دیدۂ بینا کے ریگ زار
مہر جمال یار نے دکھلا نہ دی جھلک

اٹھتا ابھی ہے سوختہ بستی سے یوں دھواں
اٹھتی ہے جیسے قلب قلندر میں اک کسک

میں ہی فقط سکوت کے نشے میں چور تھا
ڈوبا ہوا تھا شور میں پورا یہ شہر شک

کرتے ہو اجتناب کیوں اتنا گل آفتاب سے
آگ چمن میں لگ گئی شعلگیٔ گلاب سے

پیاس کے قہر کا میاں ہم کو خیال ہی نہ تھا
ہم کو بہت امید تھی دشت میں اک سراب سے

ہوگی یہ خواب گاہ بھی روشنیوں میں تر بتر
آنکھ ہماری ہوگئی شعلہ خمار خواب سے

اب کے ہوا نہ غرق آب شب کو جزیرۂ صدا
اب کے ہوا نہ مرتکب جرم سیہ سحاب سے

اب کے شریک فکر تھی ذات یہ کس کی دم بدم
اب کے ہوئے ہیں آشکار رنگ بھی آب وتاب سے

موسم زرد سے بھلا کیوں ہوں نبرد آزما
آنکھیں ہیں جن کی جھیل سی چہرے بھی ہیں گلاب سے

لب پہ لرزتی ہے تابناک دعا سی
دشت خموشی میں کوئی جوئے صدا سی

چاندستارے بھی آنکھ سے ہوئے اوجھل
دھند کے مانند چھا گئی وہ اداسی

دیکھ سر شاخ سبز اب بھی مسلسل
لے رہی ہے سانس کوئی زرد ہوا سی

پل میں ہوئے غرق ابر، نور کے منظر
آنکھ میں جنبش ہوئی تھی ایک ذرا سی

خواہش بارش کی آگ دل میں لئے تھی
شہر کے مرکز میں ایک جھیل پیاسی

شہد کی مکھی کا گیت سن نہ سکو گے
آپ کے گلدان میں گلاب ہیں باسی

گوش بر آواز شب کو سنگ و شجر تھے
چپ کسی درویش کی تھی نغمہ سرا سی

ہلنے لگا برگ برگ نخل بدن کا
آئی کہاں سے یہ جنگلوں کی ہوا سی

لایا ہے سوغات خامشی کی غزل میں
روح کے پر شور جنگلوں کا یہ باسی

لفظ کی تہ میں یہ کیسا شور ہے پنہاں
طرز تری ہے رفیقؔ راز جدا سی

کچھ تو جنوں تھا ہوا کے سر میں زیادہ
اور ثمر بھی تھے کچھ شجر میں زیادہ

صبح کو دیکھا تو مہر و ماہ تھیں آنکھیں
خواب ہی دیکھے تھے رات بھر میں زیادہ

آپ کی چپ بھی ستارہ بار ہے کتنی
آپ ہی سے روشنی ہے گھر میں زیادہ

دور سے منزل دکھائی دیتی ہے سب کو
روشنی ہے راہ پر خطر میں زیادہ

کم ہی ہوئے نذر موج عشق و لیکن
ڈوب گئے عقل کے بھنور میں زیادہ

طاق پہ جلنے سے فائدہ ہے بھلا کیا
شمس و قمر رہتے ہیں سفر میں زیادہ

چار قدم چل کے اوبتا ہے مرا دل
موڑ نہیں تیری رہ گذر میں زیادہ

تمؐ پہ درود و سلام بھیجتا ہے رب
تمؐ ہی معظم ہو بحروبر میں زیادہ

ٹوٹ گئی باندھ اور ڈوب گیا میں
یاس کے دریا تھے چشم تر میں زیادہ

بس بھی کرو اے رفیق رازؔ کہیں اب
عیب نمایاں نہ ہو ہنر میں زیادہ

روشنی میں تر رہا مثل ستارہ رات بھر
آسمانوں کے سفر پر تھا غبارہ رات بھر

نور کی موجوں میں اک ہلچل مچاتا ہی گیا
اک سکوت سبز کا روشن اشارہ رات بھر

میں یہ سمجھا پھر مبارک خواب تیرا آ گیا
دشت بینائی میں رقصاں تھا شرارہ رات بھر

کم نظر کے رخ پہ تھا اہل نظر کا سا جلال
سامنے آنکھوں کے تھا کیسا نظارہ رات بھر

آگ میں اپنی ہی خاکستر ہوا معلوم ہے
وہ بدن ہوگا نہیں روشن دوبارہ رات بھر

تیرہ و تاریک صحرا میں ستاروں کا ہجوم
آنکھ میں چبھتا رہا یہ استعارہ رات بھر

اک فلک اور ہی سر پر تو بنا سکتے ہیں
کرہَ ارض کو بہتر تو بنا سکتے ہیں

روح میں جس نے یہ دہشت سی مچا رکھی ہے
اسکی تصویر گماں بھر تو بنا سکتے ہیں

اشک سے خاک ہوئی تر یہی بس کافی ہے
ایک بے جان سا پیکر تو بنا سکتے ہیں

ہم اگر اہل نہیں پیڑ کے پھل کھانے کے
شاخ سرسبز کو خنجر تو بنا سکتے ہیں

سچ ہے ہم گر یہ کناں کچھ بھی نہیں کر سکتے
ریگ زاروں کو سمندر تو بنا سکتے ہیں

آتش و نور سے بجلی کے رہیں کیوں محروم
ہم سر دشت نیا گھر تو بنا سکتے ہیں

گرچہ پرواز کی قوت نہیں خواہش ہے بہت
ہم خیالات کو شہپر تو بنا سکتے ہیں

لالہ گوں منظر شاداب سرابوں میں بھی
قلزم خوں ہو میسر تو بنا سکتے ہیں

گہرائیوں میں ہانپتے منظر کے رنگ دیکھ
چپ چاپ ہولناک سمندر کے رنگ دیکھ

سیل سیہ کی زد میں ہے باہر ہر ایک شے
مژگاں نہ کھول غور سے اندر کے رنگ دیکھ

آنکھوں میں آرزو بھی ہے دم بھی ہے شوق بھی
ہر سمت کائینات کے جی بھر کے رنگ دیکھ

لانے لگی ہے رنگ اڑانوں کی خواہشیں
اڑنے لگے ہیں اور بھی شہپر کے رنگ دیکھ

اب اس ہوائے زرد کا ڈر کیا رفیقؔ راز
شبنم نے پی لیے ہیں گل تر کے رنگ دیکھ

ہم مر مٹے تھے روشنیٔ روئے یار پر
ہم نے دیا نہ دھیان بدن کی پکار پر

تپتا ہوا بدن ہے اجالوں سے آب آب
احسان دھوپ کے ہیں بہت ریگزار پر

دیوانہ وار کس کے تعاقب میں ہے رواں
کس کا جنوں سوار ہے یہ آبشار پر

ہے چین نے سکون نہ آتی ہے نیند ہی
حق تو یہ ہے کہ حق نہ رہا خواب زار پر

ساکت فضا کو کیسے لیا ہے گرفت میں
حیرت ہے خود ہوا کو بھی گردو غبار پر

سوچا نہیں کہ کس کا بہا خون کس قدر
رکھی نگاہ شعلگی لالہ زار پر

اب کے خزاں کی آگ اجالوں سے لیس ہے
روشن کئی چراغ ہیں ہر سو چنار پر

کیا ہو اگر سراب کی موجیں اچھل پڑیں
کیا ہو اگر سوار ہو سودا سوار پر

ہے وقت رنگ جتنے بھی چاہو سمیٹ لو
حملہ خزاں کرے گی اچانک بہار پر

کیا تو ہوگا تمام شب رقص آندھیوں نے
چراغ روشن کیئے تو ہوں گے مسافروں نے

اب ان کی آنکھوں میں پہلے جیسی چمک نہیں ہے
کیا ہے ان پر بھی وار شاید کہ حیرتوں نے

ہوئے ہیں شعلہ بدن بھی کچھ قافلوں میں شامل
لیا ہے گھیرے میں دشت وصحرا کو بادلوں نے

ہماری بستی سیاہیوں کی گرفت میں تھی
یہ بوند بھر روشنی یہاں کی ہے مہ رخوں نے

تمہیں تو منزل کی دوریوں نے تھکا دیا ہے
ہمیں تو الجھا کے رکھ دیا تھا ہی راستوں نے

ہم اپنی آتش میں جل کے روشن رہے ہیں برسوں
ہمیں تو اب راکھ کر ہی ڈالا ہے رت جگوں نے

مٹائے مٹتا نہیں ہے وہ داغ دل پہ چھوڑا
بنا دیا داغ دار بے داغ صورتوں نے

ہم اپنے اندر کی شعلگی سے رہے نمایاں
ہمیں چھپانے کی کوششیں کی تھیں ظلمتوں نے

قریب شہ رگ میں تجھ کو محسوس کر رہا ہوں
مجھے تو بے خود ہی کر دیا تیری قربتوں نے

رسّی تو ہے دراز مرے اعتبار کی
صدیوں پہ ہے محیط گھڑی انتظار کی

آتی نہیں تو نیند ہی آتی نہیں ہے بس
آتی ہیں خوشبوئیں تو بہت خواب زار کی

گر کر بلندیوں سے سنبھلتا ہے آپ ہی
مجھ کو پسند ہے یہ ادا آبشار کی

ہر چاپ سن کے ساز دھڑکنے کا چھیڑ دے
دل نے تو وہ روش ہی نہیں اختیار کی

اوجھل ہوا ہے اپنی ہی آنکھوں سے سربسر
وسعت سے ڈر گیا ہے یہ صحرا غبار کی

اب دل میں جیتنے کی ہوس بھی نہیں رہی
اب کے شدید چوٹ تھی الفت میں ہار کی

اسرار اس کی تہہ میں ہی ہوں گے وجود کے
مجھ کو لبھا رہی ہے یہ گہرائی غار کی

رنگ کوئی ایک منظروں میں نیا تھا
اب کے برس زہر موسموں میں نیا تھا

منزل مقصود کی بھی فکر نہیں تھی
ذوق سفر سارے قافلوں میں نیا تھا

نور کے سائے میں راکھ ہوگئی ہر شے
بس یہی انداز بجلیوں میں نیا تھا

وسعت صحرا میں مثل گرد ہوئے گم
سر کا یہ سودا ہی سرپھروں میں نیا تھا

اب کے شراروں میں شعلگی تھی غضب کی
جوش جواں سال خواہشوں میں نیا تھا

اب بھی گرجنے کی طرز تھی تو پرانی
شوق برسنے کا بادلوں میں نیا تھا

حیرتوں کی روشنی میں جگمگاتا آسماں
پھیلتا ہے سوچ کے مانند کتنا آسماں

نور کے چشمے ابلنے کی توقع ہے عبث
پی چکا ہے ان زمینوں کا اجالا آسماں

روح کی خاموشیوں کو جانے کیا سوجھی کہ بس
رات کے پچھلے پہر سر پر اٹھایا آسماں

سوچ کی آتش میں تر ساری زمیں پاؤں تلے
رینگتی خلقت کے سر پر ہے دھواں سا آسماں

بارش انوار برساتا ہے مجھ پر اور خود
لاتعلق ہر چمکتی شے سے نیلا آسماں

بھولا بھٹکا اس زمیں پر کون تھا جس کیلئے
پارہ پارہ ہو گیا امید آسا آسماں

لامکاں کی وسعتوں میں آندھیاں ہیں خوف کی
کاش کوئی سر پہ رکھ دے اک ذرا سا آسماں

اے خدا تو ہے محیط وسعت لا انتہا
اور سب ان وسعتوں کا ایک سایہ آسماں

رنگ ہی کچھ اور ہے قلب حزیں کا
خوف طاری تھا بہت عرشِ بریں کا

یہ بھلا کیا نقش ہے دیوار و در پر
خواب ہی ہوگا کوئی پچھلے مکیں کا

مثل خوشبو رکھ دیا آوارہ مجھ کو
خامشی نے بھی نہیں چھوڑا کہیں کا

میں تو خود ہی زہر غم سے تر بہ تر ہوں
بے اثر ہے سانپ میرے آستیں کا

تجھ پہ مر جانا ضروری ہو گیا تھا
پھول ہے تو موسم خلد بریں کا

آگ برساتا ہوا خورشید شاید
عکس ہے میرے خیالِ آتشیں کا

میرے شعروں میں چمک ہے مہر و مہ کی
رنگ ہے ظاہر مگر اپنی زمیں کا

کانپتی ہے ظلمت اطراف مجھ سے
داغ تاباں ہے مری روشن جبیں کا

تمہاری ذات کا سایہ ہے استعاروں پر
سمندروں کی حکومت ہے ریگزاروں پر

رواں تھا روح کا دریا کہ میں نے پوچھ لیا
یہ کیسا شور بپا ہے ترے کناروں پر

یہ بجلی چمکی ہوئی کس کے غور و فکر کی ہے
یہ نور کس کی نظر کا ہے ان نظاروں پر

یہ کس نے میری شب ہجر کو نکھار دیا
یہ کس نے خاک سیہ ڈال دی ستاروں پر

مکاں بھی راکھ میں تبدیل ہو رہے تھے اور
ہوا بھی ناچ رہی تھی ترے اشاروں پر

حصار لفظ سے نکلے تو خوشبوؤں کی طرح
یہ راز آج کھلا تیرے غم کے ماروں پر

کون جانے شام کو گذرے گی کیا بازار پر
رونقیں نازل نہ ہوں گی بھیڑ کے اصرار پر

شعلۂ سفاک بھڑکا تھا بھڑکتے ہی بجھا
اک چراغاں سا ہوا تھا سانس کی دیوار پر

ایڑیوں سے دشت کو دریا بنا کر چل دیا
بھید ریگستاں نے کھولے لشکر جرار پر

شور کا سیلاب تھا سب کچھ بہا کے لے گیا
ہوگئی قرباں معطر خامشی گفتار پر

فقر کی دولت سے مالامال ہیں اللہ ہو
ہم نظر رکھتے نہیں دنیا درم دینار پر

برسر پیکار سایوں سے تھے اندر سب مکیں
اور باہر دھوپ پھیلی تھی در و دیوار پر

راز کرتا ہے زبان خامشی سے تو عیاں
صوفیوں کا رنگ چھایا ہے ترے اظہار پر

ڈر ہے کہ لگ نہ جائے مرے ہی مکاں میں آگ
بھڑکی ہوئی ہے آج تو خوب آسماں میں آگ

ظاہر ارادہ اونچی اڑانوں کا کر دیا
طائر نے خود لگائی خس آشیاں میں آگ

ہر سمت بارشوں میں کھلے سرخ رو گلاب
برسات ہے لگی ہے ترے گلستاں میں آگ

جھرنے خموشیوں کے تھے دونوں طرف رواں
اور رقص کر رہی تھی کہیں درمیاں میں آگ

ورد زباں درود براہیم ہے تو پھر
ٹھنڈی رہے گی میرے لئے ہر زماں میں آگ

ایک صحرا ہے مری آنکھ میں حیرانی کا
میرے اندر تو مگر شور ہے طغیانی کا

کوئی درویش خدا مست ابھی شہر میں ہے
نقش باقی ہے ابھی دشت کی ویرانی کا

سانس روکے ہے کھڑی در سے ترے دور ہوا
خاک دل یہ ہے سبب تیری پریشانی کا

ہم فقیروں کا توکل ہی تو سرمایہ ہے
شکوہ کس منہ سے کریں بے سرو سامانی کا

دل کے بازار میں ہلچل سی مچادی اس نے
مجھ کو بھی دھوکا ہوا یوسف لاثانی کا

دیکھتا ہوں میں ابھی خواب اسی کے شب و روز
یہ خلاصہ ہے مرے قصۂ طولانی کا

چاند ستارے تھے آفتاب سے روشن
دشت و بیاباں مرے سراب سے روشن

منظر نادیدہ سامنے ہیں مرے اب
دیدۂ بینا کی آب و تاب سے روشن

ساکت و بے حس ہیں تیرگی کے سمندر
روح کی وادی ہے اضطراب سے روشن

سینۂ دریا میں عجب آگ لگی تھی
چہرۂ دریا کہ تھا حباب سے روشن

زرد ہوائیں طواف کرتی ہیں جس کا
میرا چمن ہے اسی گلاب سے روشن

جس میں کہیں خال خال ذکر تھا اس کا
قلب و نظر ہیں اس ایک باب سے روشن

جسم کو اک لمس نے ہی شعلگیاں دیں
چشم سیہ تو ہوئی تھی خواب سے روشن

اب کہ سیہ پوش مثل شمع ہوا ہے
گھر تھا مجھی خانماں خراب سے روشن

میرے شعروں میں شاہد معنی
چاہ میں جیسے یوسف ثانی

دیکھ کر کب ہماری خشک لبی
رو اٹھے گا یہ نہر کا پانی

جان لیوا سکوت میں ہیں نہاں
لذت جسم و لطف روحانی

یہ مکاں لا مکاں سا لگتا ہے
نور میں غرق خانہ ویرانی

تیرے جلوے کہ تیرے اپنے تھے
میری میراث میری حیرانی

ایک اک لفظ میں نہاں ہے مرے
گہری خاموشیوں کی طغیانی

ہم، زمستاں، چراغ، وسعت دشت
اور ہر سو ہوائیں برفانی

آ آکے ابر برسا جانے کہاں کہاں سے
ایسے میں ٹھہر سکتا کچا مکاں کہاں سے

جل بجھ چکی ہے کب کی بستی یہ عاشقوں کی
اٹھتا مگر ہے اب بھی جانے دھواں کہاں سے

سنسان تھا یہ گاؤں کس شور و شر میں ڈوبا
اترا ہے نیم شب کو یہ کارواں کہاں سے

صحرا نوردیوں کا نشہ نہیں اترتا
پہنچیں گے منزلوں پر آوارگاں کہاں سے

اہل نظر کی آنکھیں رہتی ہیں خیرہ شب بھر
لاتی ہیں نور و آتش یہ بجلیاں کہاں سے

کیوں شورشیں ہیں اتنی یارب تری زمیں پر
نازل خموشیاں کر چنگھاڑتی زمیں پر

کیا میرے فکروفن کی وقعت نہیں ہے کچھ بھی
کیا صرف مہرو مہ سے ہے روشنی زمیں پر

ہر سو اگر ہے تو ہی اے آسمان والے
لگتی ہے پھر مجھے کیوں تیری کمی زمیں پر

میں اپنے آنسوؤں سے کہنے کو تر بتر تھا
جینا تھا پھر بھی مشکل تپتی ہوئی زمیں پر

کس کا خیال جانے آیا تھا نیم شب کو
چمکی ہوئی تھی ہر سو اک آگ سی زمیں پر

کرتے ہو کیوں قوافی تبدیل رازؔ صاحب
ڈھاتے غضب ہو ایسا کیوں میرؔ کی زمیں پر

سیاہ پوش رہے کیوں سرائے دیدہ و دل
تمہارا نور ہی تو ہے بنائے دیدہ و دل

درون روح بپا حشر کر گیا ہے پھر
مزاج برہم فرماں روائے دیدہ و دل

تمہیں نہ ہوتے ہوئے بھی دکھائی دیتے ہو
تمہیں سے ہوتی ہے نشو ونمائے دیدہ و دل

ہمارے شہر کے گلشن خزاں رسیدہ تھے
ملے نہ پھول تو ہم نے بچھائے دیدہ و دل

نظارہ گرد و غبار ہوس میں لپٹا تھا
طواف کرتی تھی اس کا ہوائے دیدہ و دل

نظر میں نور خبر میں سرور سا کچھ ہے
قبول ہوگئی شاید دعائے دیدہ و دل

اگر تو نور سے لبریز اک نظارہ ہے
مرا وجود بھی کیا ہے سوائے دیدہ و دل

ملے نہ راہ تو رستہ بنا بھی سکتا ہوں
کہ میرے پاس بھی تو ہے عصائے دیدہ و دل

خیال و خواب سا نازک بدن ہے میرا صنم
اسے بنایا گیا ہے برائے دیدہ و دل

وہ ایک منظر سفاک کھو گیا ہے کہاں
کہ اک وہی تھا فقط آشنائے دیدہ و دل

خلا کو چیر کے افلاک تک پہنچتی ہے
کرن ہے نور کی سچ مچ صدائے دیدہ و دل

کھول اے برق ذرا چشم ترحم سر راہ
ہم تو ذرے ہیں بنا دے ہمیں انجم سر راہ

تیری آواز کی خوشبو نے بھی الجھائے رکھا
اپنی چپ سے بھی ہوا میرا تصادم سر راہ

حملہ آور ہوئی تھی ایک شب تار کہ پھر
خوف کی دھند میں ہر چیز ہوئی گم سر راہ

کر گیا سحر سیہ قافلے والوں پہ عجب
سنگ و اشجار کا چپ چاپ ترنم سر راہ

جستجو اپنی مجھے کھینچ کے لائی تھی یہاں
میں اسی فکر میں گم تھا کہ ملے تم سر راہ

دشت میں آ کے ملا باد بہاری کا سراغ
دیدنی تھا گل خود رو کا تبسم سر راہ

آج درپیش ہے پیاسوں کو سفر صحرا کا
دیکھ برپا ہے سرابوں میں تلاطم سر راہ

مجھے خوف آرہا تھا شب غم کے راستوں سے
کہ چمک اٹھے اچانک سرِ دشت بجلیوں سے

سرِ بابِ شہرِ ظلمت سبھی بُت بنے کھڑے تھے
کہ میں جوئے نور لایا تھا مہیب پربتوں سے

یہ زمین جس کی ہے وہ اسے غرق ہی نہ کر دے
یہ پیام آرہے ہیں مجھے کالے بادلوں سے

ثمر اور چھاؤں جس کے تمھیں تھے عزیز بے حد
وہ درخت ابھی سلامت ہے خدا کی رحمتوں سے

کوئی اور ہی کرم ہے شبِ ہجر ہے منور
نہ فلک کے اختروں سے نہ زمیں کے جگنوؤں سے

مری خامشی کہ واقف ابھی حرف سے نہ ہوگی
ابھی اس کو ہے گذرنا کئی سخت مرحلوں سے

وہ مناظر ندیدہ جو غلاف غیب میں تھے
مرے سامنے ہیں عریاں تو فقط بصیرتوں سے

ریت ہی ریت ہے زیرِ پا ابر کا سایہ سر پر نہیں
یہ زمیں کون سی ہے جسے آسماں بھی میسر نہیں

سہہ نہ پائے گا یہ اس میں طوفان اتنے نہ برپا کرو
قلبِ عاشق بس اک قطرہ ہوتا ہے کوئی سمندر نہیں

تو نے تو پیڑ پودے ہی جڑ سے اکھاڑے یہ کیا کر دیا
سانس لینے کی خاطر ہوا تھوڑی مانگی تھی صرصر نہیں

بحرِ ظلمات کیوں سرکشی پر ہے آمادہ اتنا یہاں
اس خرابے میں آباد کیا اب کوئی بھی قلندر نہیں

میری آواز میں ہے مناجات کا رنگ نکھرا ہوا
اس گلی میں کسی بھی گدا کی صدا مجھ سے بہتر نہیں

تو سیل گریہ سے تر رکھ یہ خانۂ غم دل
کہ جل نہ جائے کہیں آستانۂ غم دل

سکوت کیا ہے بس اک استعارۂ روشن
چمک رہا ہے لبوں پر فسانۂ غم دل

اکڑ اکڑ کے چلوں کیوں نہ کوے قاتل میں
گڑا ہوا ہے بدن میں خزانۂ غم دل

محیط ہے یہ قدیم و جدید پر یعنی
ازل سے تا بہ ابد ہے زمانۂ غم دل

فلک کو سر پہ اٹھائے ہوئے ہیں سناٹے
فضا میں گونج رہا ہے ترانۂ غم دل

اگر چہ دھوپ کڑی چار سو طرب کی ہے
بہت ہے میرے لئے شامیانۂ غم دل

دی یہ کس نے اذاں راستے میں
جھک گیا آسماں راستے میں

کس سفر پر روانہ ہوئے تھے
آ گیا لامکاں راستے میں

پوچھیے سچ تو خورشید بھی تھا
ذرۂ ضوفشاں راستے میں

سنگ و اشجار نے اپنی ہی کچھ
داستاں کی بیاں راستے میں

میرا سایہ ہے میرے علاوہ
اور کیا ہے یہاں راستے میں

خامشی جب ہوئی اور گہری
بن گئی ہم زباں راستے میں

جوئے معنی کہیں خامشی سے
ہو نہ جائے رواں راستے میں

تو ہی تو ہے وہاں منزلوں پر
میں ہی میں ہوں یہاں راستے میں

روشنی کے لئے تھی مقرر
ایک برق تپاں راستے میں

بھید ظلمات کے کھولتی ہے
گرد سیارگاں راستے میں

تیری آواز آئی کہیں سے
مل گئے دو جہاں راستے میں

نصب کس نے کیا تھا اچانک
ابر کا سائباں راستے میں

پھر سے منزل کا ہوگا تعین
رک گیا کارواں راستے میں

ہے ابھی دلی دور اور کتنی
کیا بتاؤں میاں راستے میں

آنکھ حیران تو تھی نور سے معمور نہ تھی
یعنی دیدار کے نشے سے ابھی چور نہ تھی

آگ نمرود کی روشن تھی وہاں کیا کرتے
تھی پہاڑی تو مگر جلوہ گہِ طور نہ تھی

میں کہ تھا خاک نشیں خاک سے وابستہ رہا
ورنہ کٹیا سے مری کاہکشاں دور نہ تھی

وہ ندی محو ثناخوانی خالق بھی تھی
کھیت کی پیاس بجھانے پہ ہی مامور نہ تھی

بے وفائی تو ہے اک رسم جہان فانی
تم بھی زندہ ہی رہو وہ بھی کوئی حور نہ تھی

ہم بھی میخانۂ دنیا میں رہے مست رفیقؔ
زہر غم جام میں تھا دختر انگور نہ تھی

ہماری طرح حروفِ جنوں کے جال میں آ
کبھی تو جلوہ گہہ نون جیم دال میں آ

ابھی تو گرد زمانے کی اڑ رہی ہے یہاں
ابھی نہ مثلِ صبا کوچۂ خیال میں آ

گزر نہ جائے کہیں خامشی میں یہ شب بھی
مُراقبہ تو ہوا اب ذرا جلال میں آ

تجھے بھی آج کوئی روپ بخشتا ہی چلوں
تو سنگ ہے تو مرے دستِ باکمال میں آ

یہاں زوال کا منظر بھی لا زوال نہیں
یقیں نہیں تو بیابانِ ماہ و سال میں آ

ہر طرف میں نے دیکھا نہ ویرانیاں ہیں نہ حیرانیاں دشت میں
یہ جو آنکھوں میں ہے دولت بے بہا وہ کہاں دشت میں

جیسے اک دھند پُرنور خاموشیوں کی ہے پھیلی ہوئی
جیسے لیٹا ہوا خاک پر ساتواں آسماں دشت میں

فقر سے اور تنہائی سے ان کو تو کوئی مطلب نہیں
ڈھونڈتے ہیں نئے استعارے یہ آوارگاں دشت میں

تجھ سے ہی روح کی شمع روشن رہی تیز آندھی میں بھی
تجھ سے ہی مثلِ فانوس یہ جسم کا خاکداں دشت میں

طائروں کو خبر ہے کہ یہ معرکہ کون کرلے گا سر
سن رسیدہ شجر ہیں مگر آندھیاں ہیں جواں دشت میں

اپنے ہونے کا احساس تک بھی نہیں ساتھ ہے کیا کروں
خود سے بھاگا ہوا میں اکیلا ہوں اس بیکراں دشت میں

اک ذرا سی ہوا کیا چلی حشر برپا ہوا ہر طرف
خشک پتوں نے سر پر اٹھایا ہے پھر آسماں دشت میں

کون وہ لوگ ہیں اس جہاں میں بھی آتش ہے جن پر حرام
روشنی کن کی راہوں میں کرتی ہیں یہ بجلیاں دشت میں

پُر شبستان ہے ظلماتِ شب تار سے بھی
کچھ نہ ہو پائے گا اب دیدۂ بیدار سے بھی

چپ ہوں اور میری خموشی بھی پر انوار نہیں
حال بد تر ہے مرا مرغِ گرفتار سے بھی

برق دنیا پہ گری ہو یہ ضروری تو نہیں
آگ لگتی ہے کبھی شعلۂ افگار سے بھی

تیری یادوں کے اُجالے تو سر آنکھوں پہ مگر
بوند بھر روشنی ہے دیدۂ خونبار سے بھی

مجھ سا ہوگا نہ کوئی زلف گزیدہ اے رازؔ
خوف کھاتا ہوں بہت سایۂ دیوار سے بھی

کھولنے والا ہے لب جادو بیاں
اب سفینے ریت میں ہونگے رواں

برگ آوارہ کو آیا ہے قرار
خاک میں لت پت ہے بادِ نیم جاں

ہجر کے اتنے گھنے ظلمات میں
آتشِ فرقت بھی کام آئی کہاں

منتظر ہوگا کہیں پیاسا کوئی
کتنی عجلت میں ہے یہ جوئے رواں

جنگلوں میں سانس لیتا ہے کوئی
خشک پتے کرتے ہیں آہ و فغاں

میرے اندر ہے کئی طوفاں لئے
بے صدا سا ایک بحر بیکراں

خانۂ خس میں شعلۂ غم ہے
یہ اُجالا تو بس کوئی دم ہے

وادیٔ روح میں ہوں سرگرداں
ہر طرف ایک ہو کا عالم ہے

قافلے ہیں رواں ہواؤں کے
سوکھے جنگل میں آج ماتم ہے

زلف پیچاں کے مرحلوں سے گزر
راستہ آگے اور پر خم ہے

پانی پانی فلک پہ ہے خورشید
روئے صحرا پہ نہر شبنم ہے

تیرے طوفاں میں شور حشر سہی
میری خاموشیوں میں بھی دم ہے

پس دیوار کے مناظر سے
چشم دیوار میں بھی اک رم ہے

جل بجھا ہے وہ تابناک بدن
روشنی خواب گہہ میں اب کم ہے

کیا ہوئی اس زمیں کی زرخیزی
جا بجا جو ابھی بہت نم ہے

دل میں ہے نقش، لب پہ جاری ہے
اسم تیرا کہ اسم اعظم ہے

وہ ساز چھیڑ دیا پائلوں نے رستے میں
کہ منہہ ہی موڑ لیا درجنوں نے رستے میں

ہمارے دل میں تڑپ نور کی کچھ اور بڑھی
کرم یہ ہم پہ کیا ظلمتوں نے رستے میں

گلاب خواب تروتازہ چشم نم میں رہا
عظیم کام کیا آنسوؤں نے رستے میں

وہ بھیڑ بھاڑ تھی پہچان کھو گئی ہوتی
ہمیں بچائے رکھا خلوتوں نے رستے میں

تمہارے شہر کی راتوں کی یاد آنے لگی
یہ سازشیں بھی رچیں جگنوؤں نے رستے میں

وہ جانتے تھے کہ منزل رواں ہے انکی طرف
کیا قیام ترے سرپھروں نے رستے میں

ہر ایک آنکھ کہ محروم حیرتوں سے رہی
اُڑائی دھول بہت قافلوں نے رستے میں

گرجتے ابر نے اب کے کیا نہ حشر بپا
نہ کوئی رقص کیا بجلیوں نے رستے میں

ہم ان پہ جیسے کوئی حملہ کرنے والے تھے
اٹھایا شور بہت بستیوں نے رستے میں

ہمیں فقیر سمجھ کر کیا نظر انداز
تمہیں تو گھیر لیا سینکڑوں نے رستے میں

ہمیں کہ سوجھ رہا تھا نہ کوئی بھی رستہ
رکھا تھا روکے ہمیں راستوں نے رستے میں

خیال مالِ غنیمت میں ہم کہ گم بھی نہ تھے
عقب سے حملہ کیا دشمنوں نے رستے میں

بہت سہارا دیا اس سفر میں بندے کو
تمہارے پچھلے برس کے خطوں نے رستے میں

ملی ہے منزل مقصود گم ہوئی پہچان
چڑھائے رنگ کئی موسموں نے رستے میں

بہت سے راز کیے دفن اپنے سینے میں
طویل رات کی تاریکیوں نے رستے میں

سامنے ایک بیابان ہے ظلمت کا
کام آئے گا فقط نور عقیدت کا

مجھکو معلوم ہے اترے گا فلک سے کیا
میں کہ مارا ہوا ہوں اپنی بصیرت کا

آ کے وہ حشر بپا کیوں نہیں کر دیتا
منتظر ہے وہ بھلا کس کی اجازت کا

خاک اُڑائی ہے بہت روح کے صحرا میں
مجھکو اندازہ نہ تھا جسم کی لذت کا

غیب سے منظر دل کش سا اُبھر آیا
معجزہ دیکھ لیا اپنی بصارت کا

منجمد شہر تمنا میں بتا یارو
گرم بازار ہے کیا اب بھی سیاست کا

آنکھ آمادہ نہ تھی جلوہ نمایاں تھا
مرحلہ طے نہ ہوا وحشت و حیرت کا

ایک اک لفظ ہوا نقش مرے دل پر
پھر بھی مفہوم نہ سمجھا ہوں عبارت کا

انکا انداز بیاں انکو مبارک ہو
میں پرستار ہوں اپنی ہی روایت کا

کسر باقی نہ چھوڑی آندھیوں نے
مجھے تھامے رکھا اپنی جڑوں نے

توشہہ رگ سے قریں ہے کیا خبر تھی
مجھے الجھائے رکھا فاصلوں نے

ترے گُم سُم مسافر پر اچانک
عجب اسرار کھولے جنگلوں نے

مرے الفاظ کی گہرائیوں میں
کیا اک رقص پھر خاموشیوں نے

ہوئی پربت پہ روشن پھر کوئی آگ
پکارا پھر تمہاری رحمتوں نے

ابھی ہیں زیست کے آثار باقی
خبر دی ہے یہ دل کی دھڑکنوں نے

ہیں خطرے بھی کڑکتی بجلیوں کے
مسائل اور ہی ہیں خلوتوں کے

گرے گا برگ آوارہ زمیں پر
لکھے گا کارنامے آندھیوں کے

کبھی جو دھیان میں کھو جاؤں تیرے
تو سناٹے بکھیروں جنگلوں کے

ہوائے جلوہ آئی ہے کہیں سے
بھڑک اٹھے دیئے حیرت کدوں کے

طبیعت رکھتے ہیں آتش فشانی
مسافر ہیں سمندر کے تہوں کے

زمیں تا آسماں ہر شے ہے روشن
اُجالے لوٹ آئے ہیں غموں کے

مرے اندر ابھی تک موجزن ہیں
سمندر چیختی خاموشیوں کے

کیسی تھی وہ عجیب تڑپ بجلیوں میں رات
کس کو تلاشتی تھیں گھنی بستیوں میں رات

نشہ بھی اپنے ہونے کا ہوتا ہے تیز تر
لہرا کے جھومتے تھے شجر آندھیوں میں رات

کیا اس زمین سبز کو ہونا ہے زیرِ آب
کیا مشورے ہوئے تھے یہی بادلوں میں رات

لگنے لگا ہے ذرہ سا اب تو ہر آفتاب
ہم یہ گزار آئے ہیں کن ہستیوں میں رات

پھیلی ہوئی ہے چار طرف ہانپتی بھی ہے
پہچان کھو گئی ہے مگر حبشیوں میں رات

پھر یاد آگئی ہمیں چشم ستارہ بار
کچھ اور بھی حسیں ہوئی تنہائیوں میں رات

منزل پہ آکے بہہ گئی سیلاب نور میں
سائے کی طرح ساتھ رہی راستوں میں رات

سبز ہوا تھی رکی ہوئی
گرد و غبار سے اٹی ہوئی

دیدۂ بینا پر ہے ابھی
خواب کی چادر تنی ہوئی

دشت میں یاد یہ آیا کون
چھاؤں اور بھی گھنی ہوئی

رقص میں تھی مصروف بہت
خاک یہ کس کی اڑی ہوئی

راکھ کے ڈھیر میں چنگاری
برسوں سے ہے دبی ہوئی

آندھی چلنے سے پہلے
ایک کلی تھی کھلی ہوئی

جایز اس میں طواف نہیں
یہ چادر ہے سلی ہوئی

ایک ہی پیڑ کی ایک ہی شاخ
جنگل میں تھی جھکی ہوئی

میری چاند سی دھرتی پر
رات ہے اب تک بچھی ہوئی

بات تو چھوٹی تھی لیکن
شعر میں ڈھل کر بڑی ہوئی

خس خانے میں رہتا ہوں
آگ ہے دل میں لگی ہوئی

لوح دل پہ ازل سے ہی
اک تصویر ہے کھدی ہوئی

عمر کی کس منزل پہ نہ تھی
عقل و جنوں میں ٹھنی ہوئی

بے بال و پر پرندہ حیراں تھا آشیاں میں
اک خاک اڑ رہی تھی ہر سمت آسماں میں

اک ایسا مرحلہ بھی آتا ہے داستاں میں
جب خامشی اچانک در آتی ہے بیاں میں

میں ہوں وہ برگِ لرزاں جس پر کھلا یہ آخر
مثلِ ہوا ہے تو ہی موجود گلستان میں

ٹوٹے پڑے ہیں مجھ پر تنہائیوں کے لشکر
دہشت مچی ہوئی ہے یادوں کے کارواں میں

تیرے سوا بھی کوئی رہتا ہے دھیان میں اب
رہتی ہے آگ سی کچھ روشن مرے مکاں میں

دریا بہائے ہونگے کتنوں نے آنسوؤں کے
یوں ہی اُگے نہ ہونگے جنگل یہ خاکداں میں

صحراؤں میں دکھائی دیتی نہیں وہ رونق
کیا کم ہوئی ہے اتنی دیوانگی جہاں میں

۶/ستمبر ۲۰۰۷ء

اٹھایا ہے پھر سر تری آرزو نے
بدن میں مچائی ہے دہشت لہو نے

یہ آنکھیں ہیں میری کہ حیرت کدے ہیں
دکھایا ہے جلوہ یہ کس خوب رو نے

نہ ان میں خموشی کی بو ہے نہ معنی
پڑے ہیں یہ لفظوں کے باغات سونے

میں زلفوں کے ظلمات میں کھو گیا ہوں
چھپائے کہاں ہیں وہ انوار تو نے

جہاں رقص کرتا ہے پت جھڑ ہمیشہ
دکھائے وہ جنگل تری جستجو نے

۸ر ستمبر ۲۰۰۷ء

صحرائے دل میں کوئی صحرا نورد آئے
گم ہوکے وسعتوں میں اپنا سراغ پائے

جگنو کی روشنی کا اندازہ ہو تو کیسے
روئے زمیں پہ کوئی تاریکیاں بچھائے

دیکھو تو دشت میں یہ کیسے نشاں ہیں روشن
یا نخل نور ہیں یہ یا رفتگاں کے سائے

تونے ہی منظروں کو بخشی ہے تابنا کی
تونے ہی دھند کے یہ پردے بھی تو بنائے

جلوؤں کی بجلیوں سے جنگل ہیں راکھ سارے
فرقت کی آگ نے بھی کیا کیا مکاں جلائے

مضمون عشق ہم بھی لائیں گے شاعری میں
پہلے تو کوئی گلرو آفت جہاں پہ لائے

۱۱ر ستمبر ۲۰۰۷ء

اب اپنا کام کرے گی ضرور صرصر بھی
بہ رنگ شعلہ ہے لرزاں یہاں گل تر بھی

سفر میں ہم کو بھی احساس تھا تحفظ کا
اک آسمان سا کچھ تھا ہمارے سر پر بھی

میں اپنے ہونے کے جنگل میں کھوگیا ہوں کہیں
میں لا پتہ ہوں خود اپنا سراغ پا کر بھی

ابھی تو خاک سے آلودہ یہ فضا بھی نہیں
ابھی ہیں جامد و ساکت ہوا کے شہپر بھی

فلک کے ایک کنارے پہ ڈیرہ ڈالے تھے
شکست خوردہ سیہ بادلوں کے لشکر بھی

وہ جن میں چشمے تڑپتے تھے عہدِ رفتہ میں
دہکتی ریت پہ پیاسے ہیں اب وہ پتھر بھی

دھواں تو رقص کرے گا ہی تیرگی میں بھی
کہ راز کھول ہی دے گا چراغ بجھ کر بھی

۱۵ر ستمبر ۲۰۰۷ء

تیری خموشیوں میں خوبو ہے جنگلوں کی
اک آگ بھی ہے روشن اسمیں یگوں یگوں کی

پانی گمان بھر ہے ریتیلی سر زمیں پر
رہنے دو دشت دل میں یہ دھوپ سی غموں کی

بڑھ جاتی ہے زمیں پر جب تیرگی زیادہ
آتی ہے آسماں سے سوغات بجلیوں کی

انجانے راستوں پر ہم پھر رواں دواں ہیں
ہم نے دوبارہ زندہ کی رسم ہجرتوں کی

وہ کارواں نہ پہنچے پہلے پڑاو تک بھی
جن کیلئے تھی رقصاں یہ دھول راستوں کی

صحرائے روح میں یہ محشر بپا ہے کیسا
لہریں سی اٹھ رہی ہیں سرکش سمندروں کی

ہر شے پہ ہے مسلط سناٹوں کی حکومت
کچھ بولتی نہیں ہے خاموشی پتھروں کی

۱۵ر ستمبر ۲۰۰۷ء

پھرتا رہوں میں دشت سیہ میں کہاں کہاں
تو نے رکھے ہیں نور کے چشمے نہاں کہاں

پانی بھی ندیوں میں تڑپتا نہیں ہے اب
یہ سنگ ہائے کوہ بھی گریہ کناں کہاں

چشم سیہ کی دھوپ ہے ہر چیز پر محیط
اب سایۂ درخت کی ظلمت میاں کہاں

اب تو بدن کے شعلے ہیں رقصاں زمین پر
اٹھتا ہے عہدِ میر کا اب وہ دھواں کہاں

صحرائے دل میں ہے جو وہی آنکھ میں بھی ہے
موجود ہے وہ ایک ہی منظر کہاں کہاں

سناٹے مقبروں کے در آئے ہیں شہر میں
ہونٹوں پہ اب ہمارے بھی آہ و فغاں کہاں

یہ تو میاں ہے تیرہ و تاریک دشتِ ہجر
بہتے ہوئے وہ نور کے جھرنے یہاں کہاں

ظلمت زدہ سہی پہ سلامت ہیں آشیاں
اب اس زمیں پہ گرتی ہیں وہ بجلیاں کہاں

مٹی بھی گیلی گیلی سی زیرِ قدم نہیں
سر پر بھی اب وہ ابر زدہ آسماں کہاں

۷؍اکتوبر ۲۰۰۷ء

باطن میں ہوں فلک پہ بظاہر زمین پر
بکھرے ہوئے ہیں میرے مناظر زمین پر

دیکھا جو رزق اپنا خلاؤں سے بھی پرے
پر پھڑپھڑا کے رہ گئے طائیر زمین پر

ہم بھی تو کچھ ہوئے تھے میاں بے لگام سے
اترے اسی لئے ہیں یہ جابر زمین پر

وہ زعفراں وہ چشمے وہ گلزار کیا ہوئے
اُگ آئے ہیں ہزاروں مقابر زمین پر

ڈھاتا ہوں قہر تیرگی نیم شب پہ میں
کرتا ہوں مہروماہ کو حاضر زمین پر

مسکن ہے جن کا سرحد افلاک سے پرے
وہ بھی ملیں گے خاک میں آخر زمین پر

اٹھنے کو ہے خیال کی آندھی دماغ میں
ہونے کو ہے فساد بپا پھر زمین پر

اب تو اکڑ کے چلتے نہیں رینگتے ہیں ہم
کیا کیا کِیا نہ آپ کی خاطر زمین پر

۷/اکتوبر۲۰۰۷ء

پہلا سفر ہے رات ہوئی بستیوں سے دور
ڈرتا ہوں اگ نہ آئے بیاباں میں نخلِ نور

برپا نواح روح میں کیسا یہ حشر ہے
دریائے خامشی کے کنارے سے کچھ ہی دور

درپیش موج خیز بدن کا سراب تھا
ہم نے تو راتوں رات اسے بھی کیا عبور

سایہ کئے ہوئے ہیں ہمارے سروں پہ آج
پارے کچھ ابر کے کہ تھکن سے ہیں چور چور

اُگتی ہے آنگنوں میں ہمارے بھی فصلِ غیب
خوش ہیں چھتوں پہ عالم لاہوت کے طیور

کس نے دیا یہ حکم کہ چشمے ابل پڑے
توڑا یہ کس نے کوہِ پراسرار کا غرور

۱۰/اکتوبر ۲۰۰۷ء

رنگوں میں فکر تاب سفید و سیاہ و سرخ
ہیں بسکہ باریاب سفید و سیاہ و سرخ

اس سرزمیں کا حال برا ہے کہ اس پہ اب
روشن ہیں آفتاب سفید و سیاہ و سرخ

کشمیر ہے یہ روس نہیں ہے کہ اس نے تو
دیکھے ہیں انقلاب سفید و سیاہ و سرخ

میں نے رکھا تھا پہلا قدم دن کے دشت میں
آنکھوں میں رکھ کے خواب سفید و سیاہ و سرخ

رخسار و زلف و لب پہ لکھی جائے اک کتاب
اس کے ہوں تین باب سفید و سیاہ و سرخ

دل سے ابھی گئی نہیں داغوں کی وہ بہار
تازہ ہیں کچھ گلاب سفید و سیاہ و سرخ

۱۵/اکتوبر ۲۰۰۷ء

ہماری روح میں جنگل سا کچھ اُگ آیا تھا
اکیلے پن نے بلآخر یہ رنگ لایا تھا

رکے نہیں کہ جنوں ہی سوار تھا ہم پر
اس ایک دشت میں دیوار تھی نہ سایا تھا

وہ ایک منظر بے منظری جو غیب میں تھا
نہ جانے دیدۂ بینا میں کب در آیا تھا

اگر تھی ساکت و جامد فضا ہی دل کی پسند
تو اس میں آکے بھلا حشر کیوں اٹھایا تھا

عطا ہوئی تھی مجھے کیا صداؤں کی سوغات
سکوت شہر خموشاں جو توڑ آیا تھا

نہ تھا چراغ بھی خوابوں کا اسکی آنکھوں میں
وہ جس کے سر پہ بھیانک شبوں کا سایا تھا

یہاں بنی ہے اب اک یادگار قاتل کی
یہیں پہ اس نے ہمارا لہو بہایا تھا

وہ جس کی خوشبو سے حیراں تھے سارے ہی موسم
اک ایسا پھول خزاؤں نے بھی کھلایا تھا

ابھی تھے دھند کے صحرا کے راز سربستہ
وہ شہسوار ابھی موج میں نہ آیا تھا

۲۱/اکتوبر ۲۰۰۷ء

سحر کیسا یہ نئی رت نے کیا دھرتی پر
مدتوں بعد کوئی پھول کھلا دھرتی پر

جانے اس کرۂ تاریک میں ہے نور کہاں
جانے کس آنکھ میں ہے خواب ترا دھرتی پر

آسمانوں سے خموشی بھی کبھی نازل کر
روز کرتے ہو نیا حشر بپا دھرتی پر

آسمانوں میں الجھتے ہو سیہ ابر سے کیوں
آ فقیروں کی طرح خاک اڑا دھرتی پر

اب بھی ہلتا ہے مرا نخل بدن سرتاپا
اب بھی چلتی ہے ہوس ناک ہوا دھرتی پر

کوئی آواز کہیں سے بھی نہیں آتی ہے
قاف تا قاف ہے کیسا یہ خلا دھرتی پر

اب بھی وابستہ ہیں امیدیں تمہیں سے ہم کو
اب بھی ہوتی ہے تری حمد و ثنا دھرتی پر

ہجر کی زرد ہوا یونہی اگر چلتی رہے
ایک بھی پیڑ رہے گا نہ ہرا دھرتی پر

۱۴ر فروری ۲۰۰۸ء

کرۂ ارض کو تاریک بنا دینا تھا
ہجر کی شب میں ستاروں کو بجھا دینا تھا

کتنی دہشت ہے مرے شہر میں سناٹے کی
نخل آواز یہاں بھی تو لگا دینا تھا

تو کہ موجود اگر مثلِ ہوا صحن میں تھا
شجر جامد و ساکت کو ہلا دینا تھا

پرسکوں کب سے مرے دل کا ہے صحرائے سکوت
آ کے اس میں بھی کبھی حشر اٹھا دینا تھا

حسن کے منظر سفاک نظر آتے صاف
پردۂ خواب کو آنکھوں سے ہٹا دینا تھا

رنگ کچھ صبح قیامت کا الگ ہی ہوتا
چہرۂ مہر سے بھی رنگ اڑا دینا تھا

۱۶ر فروری ۲۰۰۸ء

بے سبب یونہی کبھی اشک بہا آخر شب
نقش خوابوں کے ان آنکھوں سے مٹا آخر شب

دور تک منظر آواز کی دہشت پھیلی
اک پرندہ سا فضاؤں میں اڑا آخر شب

موج ظلمات کبھی سر سے گزر جاتی ہے
جاری ہوتی ہے کبھی نہر ضیا آخر شب

چشم بینا سے نکلتی ہیں شعاعیں کیسی
حشر ہے دھند کے اس پار بپا آخر شب

میں ہوں بیدار غم ہجر میں شب خیز نہیں
عالم غیب سے پردہ نہ اٹھا آخر شب

آج بھی آئی کہیں سے نہ تمہاری خوشبو
آج بھی جامد و ساکت تھی ہوا آخر شب

کون للکارتا ہے دشت میں سناٹے کو
کون ہوتا ہے یہاں نغمہ سرا آخرِ شب

دھیرے سے چلنے لگی لب پہ دعاؤں کی ہوا
دھیرے سے ہلنے لگا برگِ صدا آخرِ شب

۱۹؍فروری ۲۰۰۸ء

کوئی سرحد دکھائی نہیں دیتی ہے ملکِ ظلمات کی
جانے پھیلی ہوئی سلطنت ہے کہاں تک سیہ رات کی

یہ مکیں صوفیوں کی طرح چپ ہیں لب کھولتے ہی نہیں
داستاں کہہ رہی ہے یہ بوسیدگی ان مکانات کی

خاک آلودہ منظر تو میرا ہے ویسے بھی لرزاں بہت
اپنی آنکھیں نہ کھول ان میں پہنائیاں ہیں سماوات کی

آئے تو آئے کیسے نئے موسموں کی نئی روشنی
دشت الفاظ پر دھند چھائی ہوئی ہے روایات کی

خوب ہے رقص باد صبا کا نظارا بہت ہی مگر
دیدنی ہے یہ آوارہ گردی بھی سوکھے ہوئے پات کی

غم کے بادل بہت ہی گھنے تھے اچانک برسنے لگے
مدتوں بعد آنکھوں کے صحرا میں رت آئی برسات کی

۲۳ر فروری ۲۰۰۸ء

مشراق

کیا ہوئی اے بتِ بے پیر تری جلّادی
سانس لیتے ہیں ترے در پہ ابھی فریادی

دشت ظلمات میں ظلمت کے سوا کچھ بھی نہ تھا
تھی نہاں قلزم خوں میں سحر آزادی

عہد رفتہ کے فسوں گر کا ٹھکانا تھا یہیں
ان چٹانوں میں کوئی ایک ہے وہ شہزادی

اس جگہ کون ہے یہ چلّہ کشی پر مامور
دھند کس نے یہ خموشی کی یہاں پھیلادی

ان دہکتے ہوئے صحراؤں نے تن پر اپنے
کن ہواؤں سے عبارت یہ عجب لکھوادی

۹ر مارچ ۲۰۰۸ء

کسی کے سر پہ جنونِ سفر سوار نہیں
فضائے دشت کہ آلودۂ غبار نہیں

یہ کس سکوت کی سلطانی کا زمانہ ہے
ہمیں تو سانس بھی لینے کا اختیار نہیں

ہمارے عہد میں بے برگ و بار پیڑوں کو
نسیم خلدِ بریں پر بھی اعتبار نہیں

یہاں تو پھول کھلائے ہیں موسم ہو نے
لہو جہاں پہ گرا تھا یہ وہ دیار نہیں

خس نظارہ بھی اب تو نہیں ہے آتش گیر
نگاہ اہل نظر میں بھی اب شرار نہیں

اگر نہیں ہے مدینے کا رنگ اس میں، تو
کوئی بھی فکر کا موسم ہو، خوشگوار نہیں

۲۳ر مئی ۲۰۰۸ء

پنہاں تھے کچھ سوال تمہارے جواب میں
آوارہ پھر رہا ہوں جہانِ کتاب میں

سوچو تو اب بھی لفظ میں امکاں ہزار ہیں
دیکھو تو اب بھی قید ہے دریا حباب میں

سویا ہوا ہوں ساحلِ دریا پہ ظاہراً
پیاسا بھٹک رہا ہوں بیابان خواب میں

اب لہلہائے گا نہ کوئی شعلہ زارِ جسم
چنوا دیا گیا ہوں میں دیوارِ آب میں

ہر رات انتظارِ سحر میں گزر گئی
لکھنے کو اور کچھ نہیں خوابوں کے باب میں

روئے زمیں کے منظر انوار دیکھ کر
ہے چاند بھی فلک پہ عجب پیچ و تاب میں

موجوں نے ایک حشر تھا برپا کیا ہوا
اک بحر بیکراں سا نہاں تھا سراب میں

پھرتی تھی تیرے سانس کی خوشبو لئے ہوا
موسم تھے اور طرح کے عہد شباب میں

سکوت سبز کی خوشبو تھی عہدِ ہجراں میں
مہک رہا تھا کہیں باغ سا بیاباں میں

غبار عالم ہوٗ بھی صدا کی زد میں تھا
اٹھا ہوا تھا کوئی حشر دشت امکاں میں

چراغ فکر سے روشن تو تھا وجود، مگر
اک اضطراب سا تھا شعلۂ فروزاں میں

ابھی تلک یہ خرابہ ہوا نہیں ویراں
بسا ہوا ہے ابھی خوف خطۂ جاں میں

طلوع منظر انوار کی امید نہ تھی
بس اک بلا کا تذبذب تھا چشم حیراں میں

لگے نہ روح کے ان جنگلوں میں آگ کہیں
حسِ وجود نہ رکھ فکرِ شعلہ ساماں میں

مرے بھی لمس نے کچھ سحر تو کیا، لیکن
ترے بدن سے ہوئی روشنی شبستاں میں

شعلگی فکر فروزاں میں نہ تھی
روشنی عالم امکاں میں نہ تھی

صبح دم باد صبا بھی رقصاں
خیمۂ دودِ گریزاں میں نہ تھی

برق رفتار نہ تھے ناقہ سوار
گرد اطراف بیاباں میں نہ تھی

کتنی ظلمت ہے ترے گیسو میں
اتنی ظلمت شب ہجراں میں نہ تھی

سہمی سہمی تھی ہوا رن کے بعد
خاک بھی عرصہ گہہ جاں میں نہ تھی

بدلیاں بھی نہیں مصروف طواف
اور کشش بھی مہہِ تاباں میں نہ تھی

۲۲/مئی ۲۰۰۸ء

کھلا سکتا ہے موسم عاشقی کا، گل کہیں پر بھی
بہاریں مہرباں ہوسکتی ہیں صحرا نشیں پر بھی

کھلا دے منظر انوار ان بے خواب آنکھوں میں
گرا دے برق حیرت کی دیار آتشیں پر بھی

مکان بے در و دیوار میں اب خاک اڑتی ہے
ہوئی صحرا نوردی عشق میں واجب مکیں پر بھی

دعاؤں کا اثر ہوتا ہے خوشبوئے خموشی میں
اٹھا لیتی ہے محشر خامشی عرش بریں پر بھی

وہ میرا ہم قدم کیا ہوگیا ہر ہر قدم پر اب
گماں ہوتا ہے چرخ ہفتمیں کا اس زمیں پر بھی

ار جون ۲۰۰۸ء

کیا پتہ فقر مرا رنگ بھی لایا کہ نہیں
لامکاں میرے مکاں میں بھی در آیا کہ نہیں

رتبۂ خاک بیابان میں پایا کہ نہیں
کچھ تو ہونے کا نشہ روح پہ چھایا کہ نہیں

رقص تو دیدۂ بینا کی شعاعوں نے کیا
رنگ بھی چہرۂ منظر سے اڑا، یا کہ نہیں

کھل گیا بھید کوئی دل پہ سکوت شب کا
خاک پر نغمۂ لاہوت سنا، یا کہ نہیں

دل سے تو اٹھتا رہا شب کو دعاؤں کا دھواں
پسِ افلاک کوئی حشر اٹھا، یا کہ نہیں

میں تو بس اپنی ہی دھن میں تھا مجھے کیا معلوم
چرخ اول پہ خدا رات کو آیا کہ نہیں

۹ر جون ۲۰۰۸ء

فضا میں بس غبار کارواں ہے
سکوت مرگ ہے اور دشتِ جاں ہے

سفر میں اب کے گام اولیں پر
مجھے درپیش ہفتم آسماں ہے

تری خاطر یہاں تک آگیا ہوں
یہاں تو میں ہی میں ہوں تو کہاں ہے

یہ سناٹا جو گہرا ہے بہت ہی
یہی تو نغمۂ آوارگاں ہے

مرا ہونا نہ ہونے میں ہے مضمر
نشاں میرا کہ بے نام و نشاں ہے

لگائی آگ پھر خاموشیوں نے
کہ موسم ہُو کا ہے ہر سو دھواں ہے

۹؍جون ۲۰۰۸ء

نہیں ہے روشنی میری سیاہ خانوں میں
میں جل رہا ہوں بہت دور آسمانوں میں

خموش ہوں پہ مخاطب تمہیں سے ہوں یعنی
مرا شمار بھی ہوتا ہے خوش بیانوں میں

نہ گل کی آگ ہی بھڑکی نہ برق ہی چمکی
کئی دنوں سے اندھیرا ہے آشیانوں میں

ہماری فکر کا موسم بھی آہی جائے گا
ہمارا ذکر بھی ہوگا کبھی فسانوں میں

مقیم ہوگئے بستی میں کون سے درویش
مہک رہی ہے خموشی سی اب مکانوں میں

مجھے بھی دونوں جہانوں میں سرخ رو کر دے
کہ میں نے تیری ثنا کی ہے دو زبانوں میں

قدم قدم پہ ابلتے ہیں چشمہ ہائے سکوت
عجیب راز ہیں سربستہ ان چٹانوں میں

۹/جون ۲۰۰۸ء

ارض ہے یا کوئی سمائے سکوت
خاک میں کچھ نہیں سوائے سکوت

غور سے دیکھ چشم بینا کھول
نقش بر سنگ ہے صدائے سکوت

دے اٹھا لو چراغ وحشت کا
نذرِ آتش ہوئی سرائے سکوت

ذکر و اذکار سے گزر کہ فقط
فکر درویش ہے بنائے سکوت

لئے پھرتا ہوں دشت وصحرا میں
چشم بینا میں چشمہ ہائے سکوت

محشر ستان روح میں اے کاش
شام سے پہلے ہی در آئے سکوت

جادۂ شب پہ دیکھ آنکھیں کھول
جگمگاتے نقوش پائے سکوت

سایۂ نخل حرف میں یوں ہی
رقص کرتی رہے ہوائے سکوت

خواہشوں کا فتور باقی ہے
شور سا دل میں ہے بجائے سکوت

لفظ ہوتے ہیں خامشی پہ نثار
استعارے بھی ہیں برائے سکوت

۱۲/ جون ۲۰۰۸ء

عکس آنکھوں میں نہ تھا شعلۂ حیرانی کا
کوئی امکاں بھی نہ تھا منظر امکانی کا

مجھ پہ خورشید جہاں تاب کے اکرام کہاں
مجھ پہ سایہ ہے کسی نخل بیابانی کا

بجلیوں کی یہ چمک رہنے دے کچھ دیر ابھی
کچھ نظارا تو کروں سوختہ سامانی کا

آنکھ ہے اور بیابان شب ہجر ہے اب
خواب دیکھا تھا کبھی خواب کی ارزانی کا

جلتا رہتا ہے ہر اک رنگ میں وہ مثل چراغ
حال مت پوچھ شب تار کے زندانی کا

نام کس کا یہ مرے خشک لبوں پر آیا
ہوگیا چشمہ رواں زیر قدم پانی کا

یہ غزل تو ہے بہت خوب رفیق احمد رازؔ
رنگ ہے اور کچھ اس نغمۂ لافانی کا

۱۳/جون ۲۰۰۸ء

ابر کے پارے کو میں نے ماہ تاباں کردیا
ہجر میں اہل نظر کو یوں پریشاں کردیا

ان مناظر کو ترے چہرے سے کچھ نسبت نہ تھی
جن مناظر نے مری آنکھوں کو حیراں کردیا

اب کہاں لب پر ہمارے نالۂ آتش فشاں
عہد حاضر میں فلک کو ہم نے ویراں کردیا

خانۂ تاریک میں اک گوشۂ تنہائی تھا
حالت وحشت میں اسکو ہی بیاباں کردیا

استعاروں میں یہ مجھ سے معجزہ سرزد ہوا
سائے کو دیوار سے میں نے گریزاں کردیا

خواہش دیدار کے شعلوں نے پل بھر کیلئے
غیب کے رنگوں کو منظر میں نمایاں کردیا

دینے والے اب عطا کر جتنا تجھ سے ہوسکے
میں نے تو صحرائے امکاں کو ہی داماں کردیا

۱۲/۱اکتوبر۲۰۰۸ء

ہر طرف دل کے بیاباں میں ہے صرصر خاموش
مدتوں بعد ہوا عرصۂ محشر خاموش

اٹھنے ہی والا ہے صدرنگ معانی کا غبار
ایک طوفاں ہے ابھی لفظ کے اندر خاموش

گھر کی بوسیدگی نے توڑ دیا اپنا سکوت
چپ ہے دیوار کوئی اب نہ کوئی در خاموش

کسی نادیدہ جزیرے کی صدا ہی آتی
ایک پل کیلئے رہتا یہ سمندر خاموش

تیز اور تند ہوا سے نہیں واقف یہ ابھی
خشک ہوتے ہوئے پتے ہیں شجر پر خاموش

حکمرانی ہے کڑی دھوپ کی گلزاروں پر
آسماں پر ہے سیہ ابر کا لشکر خاموش

غیر آباد ہیں افلاک ترے ربّ جلیل
بے پرو بال دعائیں ہیں زمیں پر خاموش

آپڑا وقت صنم خانۂ دنیا پہ عجب
اب صنم بولتے ہیں اور صنم گر خاموش

۱۹/اکتوبر۲۰۰۸ء

خشک پتا سا پس افلاک آوارہ ہوا
موسم ہوُ میں میاں میں بھی خلا آرا ہوا

جسم نازک کا تصور کتنا آتش ناک ہے
جو لہو میری رگوں میں تھا وہ سب پارہ ہوا

میں ہوں اور صوت وصدا کی روشنی کا رقص ہے
شب سکوت آتشیں پل بھر میں فوارہ ہوا

جسم کے دلدل سے برسوں بعد میں نکلا ہی تھا
روح کے پر ہول صحراؤں میں آوارہ ہوا

دشت بینائی میں آخر معجزہ ہو ہی گیا
اب کے تو نابود منظر کا بھی نظارہ ہوا

ہجر میں میں نے کیا شدت سے اسکو یاد کیا
کرۂ ظلمات پر روشن وہ مہہ پارہ ہوا

خاک پر ہوں خاک سے لیکن کوئی نسبت نہیں
سایۂ پامال ہوں دیوار کا مارا ہوا

غیب کے منظر کے چند آثار سے ظاہر ہوئے
ذرۂ صحرائے امکاں آنکھ کا تارا ہوا

۲۸/اکتوبر ۲۰۰۸ء

مرے وجود کا نام و نشاں ہے یا کہ نہیں
بدن میں دفن کہیں دشت جاں ہے یا کہ نہیں

طلوع مہر کا انداز ہی بتا دے گا
فلک پہ نالہ شب کا دھواں ہے یا کہ نہیں

ملیں جو خاک نشیناں تو پوچھ لوں ان سے
زمیں پہ سلطنتِ آسماں ہے یا کہ نہیں

نکل کے شہر سے اب جنگلوں میں دیکھ ذرا
کہیں سکوت کا چشمہ رواں ہے یا کہ نہیں

وہ حجرہ جس میں شب و روز خاک اُڑتی ہے
وہ حجرہ مرکز سیار گاں ہے یا کہ نہیں

نہ کھول آنکھیں تو اپنی زباں تو کھول، بتا
مکاں میں حیرت و ہُو کا سماں ہے یا کہ نہیں

۲۵/دسمبر ۲۰۰۸ء

سکوت و ہُو کا عالم ہے کوئی آواز پا آئے
گزر جائے کوئی سنسان کوچے سے صدا آئے

پسِ دیوار گریہ پیاس کا صحرائے اعظم تھا
سرِ دیوار ہی کچھ آب کے منظر بنا آئے

میں صحرائے سکوت بیکراں میں کب سے تنہا ہوں
سراپا گوش ہوں ناقہ سواروں کی صدا آئے

جہاں زیرِ زمیں انوار کے چشمے تڑپتے ہیں
کسی دن روح کے ان جنگلوں سے بھی ہوا آئے

مری آنکھوں کے قلزم میں نہ طوفاں ہے نہ سناٹا
کوئی منظر نظر کی زد میں اب کے خواب سا آئے

گرجتے ہیں یہاں پر شور و شر کے بحرِ بے پایاں
الٰہی یہ زمیں اب زیرِ فرمانِ خلا آئے

۲۵/دسمبر ۲۰۰۸ء

مرے وجود کا نام و نشاں ہے یا کہ نہیں
بدن میں دفن کہیں دشت جاں ہے یا کہ نہیں

طلوع مہر کا انداز ہی بتا دے گا
فلک پہ نالہ شب کا دھواں ہے یا کہ نہیں

ملیں جو خاک نشیناں تو پوچھ لوں ان سے
زمیں پہ سلطنتِ آسماں ہے یا کہ نہیں

نکل کے شہر سے اب جنگلوں میں دیکھ ذرا
کہیں سکوت کا چشمہ رواں ہے یا کہ نہیں

وہ حجرہ جس میں شب و روز خاک اُڑتی ہے
وہ حجرہ مرکز سیار گاں ہے یا کہ نہیں

نہ کھول آنکھیں تو اپنی زباں تو کھول، بتا
مکاں میں حیرت و ہُو کا سماں ہے یا کہ نہیں

۲۵/دسمبر ۲۰۰۸ء

سکوت و ہُو کا عالم ہے کوئی آواز پا آئے
گزر جائے کوئی سنسان کوچے سے صدا آئے

پسِ دیوار گریہ پیاس کا صحرائے اعظم تھا
سرِ دیوار ہی کچھ آب کے منظر بنا آئے

میں صحرائے سکوت بیکراں میں کب سے تنہا ہوں
سراپا گوش ہوں ناقہ سواروں کی صدا آئے

جہاں زیر زمیں انوار کے چشمے تڑپتے ہیں
کسی دن روح کے ان جنگلوں سے بھی ہوا آئے

مری آنکھوں کے قلزم میں نہ طوفاں ہے نہ سناٹا
کوئی منظر نظر کی زد میں اب کے خواب سا آئے

گرجتے ہیں یہاں پر شور و شر کے بحرِ بے پایاں
الٰہی یہ زمیں اب زیر فرمانِ خلا آئے

۲۵/دسمبر ۲۰۰۸ء

جمالِ سلطنتِ خاک ہے یہ خاکِ سیہ
اڑے تو رونقِ افلاک ہے یہ خاکِ سیہ

ترے دیار کے ان نیلگوں فضاؤں میں
مری اُڑائی ہوئی خاک ہے یہ خاکِ سیہ

مری ہی آنکھوں سے دریا رواں ہیں چاروں طرف
مجھی سے دشت میں نمناک ہے یہ خاکِ سیہ

ہوا چلے نہ چلے رقص کرتی رہتی ہے
جنونِ عشق میں بیباک ہے یہ خاکِ سیہ

زمیں ہے تخت مرا آسماں ہے سر کا تاج
فقیر ہوں مری پوشاک ہے یہ خاکِ سیہ

یہ خاک کوچۂ دلبر سے اڑ کر آئی ہے
زہے نصیب بہت پاک ہے یہ خاکِ سیہ

رفیق رازؔ میں اتنا بھی تنگ دست نہیں
جہان میں مری املاک ہے یہ خاکِ سیہ

۷/دسمبر ۲۰۰۸ء

روئے زمیں پہ سلطنت خاک اب کہاں
ساز سکوت و نغمۂ افلاک اب کہاں

کرتی ہے تیز و تند ہوا رقص آج بھی
آتے ہیں وجد میں خس و خاشاک اب کہاں

بوسے کی لذتوں سے تیرے کانپتے ہیں لب
میرے بھی لب پہ نالۂ بے باک اب کہاں

رہتا جہاں میں سبزۂ پامال کی طرح
اس شہر میں وہ کوچۂ سفاک اب کہاں

دروازے رحمتوں کے فلک نے کئے ہیں بند
پھیلائیں اپنا دامن صد چاک اب کہاں

معمور ہیں یہ آتشیں جلوؤں سے آج کل
تپتی سلگتی آنکھیں ہیں نمناک اب کہاں

مجھ سے ہی سیل کی صورت ہے ترے جل تھل میں
مثلِ ماہی میں تڑپتا ہوں مگر دلدل میں

شبِ ہجراں کے ستارے بھی ہیں مجھ سے لرزاں
شیر کی آنکھ سا روشن ہوں سیہ جنگل میں

بہتے دریا کی صدا تک بھی نہیں آتی ہے
آخر شب کی خموشی ہے غضب مقتل میں

ہو مبارک خس و خاشاکِ زمیں کو یہ خبر
آب کم آگ زیادہ ہے سیہ بادل میں

جن مناظر کا کہیں نام و نشاں تک بھی نہ تھا
ان مناظر کو اڑا لائی نظر اک پل میں

۱ر فروری ۲۰۰۹ء

رقصاں ہے صدائے موجِ طوفاں
دریا کی تہہ میں چپ بیاباں

ان نور کے منظروں میں کیوں ہے
اک رنگِ سکوت ہی نمایاں

بوسیدہ اگر ہے جسم تو کیا
شاداب ہے تجھ سے خطۂ جاں

آنکھوں میں وہ شوخ دیدہ اپنی
رکھتا ہے متاعِ برق و باراں

اس بار چلی ہوا یہ کیسی
اب تک ہے نخلِ جسم لرزاں

خوابوں کے علاوہ دشتِ شب میں
اک دیدۂ شیر بھی ہے تاباں

دن رات فضائے دل میں ہر سو
اڑتا ہے غبارِ کوئے جاناں

گونجے گا رفیق رازؔ اک دن
افلاک میں نغمۂ خموشاں

۷؍فروری ۲۰۰۹ء

خاموشی کے جنگل میں خوشبوئے صدا سی رقصاں ہے
تنہائی میں حشر بپا ہونے کا روشن امکاں ہے

ساری رات کٹی آنکھوں میں ایک بھی خواب نہ آیا کیا
آج تو اے جاناں تیرا یہ دیدۂ شوخ بھی ویراں ہے

اب تو سارے رنگ ہیں پھیکے حشر کے خالی میداں میں
حشر کے بعد کے منظر میں بس رنگ سکوت نمایاں ہے

نظریں اٹھا کر کس درویش نے سوئے فلک دیکھا ہے آج
ابر کے دشتِ بے پایاں میں آج یہ کیسا چراغاں ہے

کیسے مناظر کیسے نظارے جانے یہاں پر اگتے تھے
عہدِ قدیم کی دیواروں کی آنکھ ابھی تک حیراں ہے

۱۵ر فروری ۲۰۰۹ء

اک دھواں اُٹھ رہا ہے آنگن سے
ہیں ابھی کچھ چراغ روشن سے

اس میں شامل ہے بوئے افلاکی
یہ ہوا آرہی ہے کس بن سے

دینے آیا ہوں فتح کا مژدہ
بھاگ آیا نہیں ہوں میں رن سے

منزلوں کی بھی آرزو ہے بہت
ڈر بھی لگتا ہے مجھ کو رن بن سے

اب بھی کیا رات کے اندھیرے میں
شعلہ اٹھتا ہے گلشنِ تن سے

سرخ رو عشق کی بدولت ہوں
کہ میں اس آگ میں ہوں بچپن سے

یہ زمانہ ہے چاپلوسی کا
ہم تو واقف نہیں اسی فن سے

مجھ سے پہچان تیری قایم ہے
میں تمہیں چاہتا ہوں تن من سے

۱۵ر فروری ۲۰۰۹ء

خلا میں اڑنے کا منصوبہ میں اکثر بناتا ہوں
پڑا ہوں خاک پر اور ابر کے شہپر بناتا ہوں

لیا کرتا ہوں لفظوں سے ہی اکثر کام رنگوں کا
کہ میں اہلِ نظر کے واسطے منظر بناتا ہوں

کوئی آشفتہ سر ممکن ہے ان گلیوں سے بھی گزرے
میں لڑکوں کیلئے کچھ موم کے پتھر بناتا ہوں

سفر میں یوں طلب کرتا ہوں میں رب سے کوئی چشمہ
دہکتی ریت پر تصویرِ چشمِ تر بناتا ہوں

میں پیاسا ہوں مگر پیاسے لبوں کو تر نہیں کرتا
برستے مینہہ کے قطروں سے میں گوہر بناتا ہوں

۱۵ر فروری ۲۰۰۹ء

سیاہ دشت کی جانب سفر دوبارہ کیا
نہ جانے قاف کی پریوں نے کیا اشارہ کیا

نہ تیز و تند ہوا سے ملی نجات مجھے
نہ میں نے سلطنتِ خاک سے کنارہ کیا

فلک کی سمت نگاہیں اٹھانے سے پہلے
زمیں کے سارے مناظر کو پارہ پارہ کیا

سیاہ بن میں چمکتا ہوں مثلِ دیدۂ شیر
یہ کس نے ذرۂ آوارہ کو ستارہ کیا

خمارِ خواب اترنے میں تھوڑی دیر لگی
پھر اس کے بعد بڑے شوق سے نظارہ کیا

یہ کس نے موند کے آنکھوں کو پھر سے کھول دیا
یہ کس نے آپ کو دنیا پہ آشکارا کیا

ہمارے ہونے کے منظر کی بھی کرامت دیکھ
تمہاری چشم کو فوارۂ شرارہ کیا

نشے میں نقشہ ریاست ہی کا بگاڑ دیا
یہ کیا کیا کہ سمر قند کو بخارا کیا

۲۰ رفروری ۲۰۰۹ء

رفتار اپنی تیز نہ کر اے سوار دیکھ
وحشت زدہ ہے دشت میں تیرا شکار دیکھ

یوں ہی نہیں چمکتی ہیں آنکھوں میں حیرتیں
نازک نہال سبز میں پوشیدہ نار دیکھ

اک قطرۂ سکوت میں دریا کا شور سُن
اک روشنی کی بوند میں امکاں ہزار دیکھ

مت سوچ موسموں نے لگائی یہ کس طرح
کس آگ میں نہائے ہوئے ہیں چنار دیکھ

وہ منظر جمال ہے ادارک سے پرے
ساحل سے آگے سرحد امکاں کے پار دیکھ

تو نے سپر ہی توڑ دی میرے سکوت کی
اب تو یہ کان کھول کے میرے بھی وار دیکھ

نخلِ ہوس کے سائے میں جلنے سے پیشتر
باغِ بدن پہ چھائی ہے کیسی بہار دیکھ

اس بحرِ بے کنار کو پہلے عبور کر
پھر ساحلِ سکوت پہ خود کو اتار دیکھ

اس کارواں نے کوچ کیا ہے ابھی ابھی
اڑتی ہوئی یہ خاک یہ گردو غبار دیکھ

اترا ہے کس جگہ پہ رگڑتا ہے ایڑیاں
پیاسا کئی دنوں کا وہ ناقہ سوار، دیکھ

اک موج کی صدا ہوں خلاؤں کے آر پار
کس بحرِ بے کنار سے ہوں ہم کنار دیکھ

خوابوں سے عاری دیدۂ دیوار بھی نہیں
یہ آتشیں سرور یہ رنگِ خمار دیکھ

بے منظری میں بھی ہیں نظارے ہزارہا
آنکھوں کو بند کر کے ذرا ایک بار دیکھ

بیرون جسم عمر گزاری رفیقِ رازؔ
اک رات اپنے آپ میں اب تو گزار دیکھ

۲۰ فروری ۲۰۰۹ء

خالی ہاتھ ہیں بات مگر کچھ اور ہی ہے آواروں کی
دو دو آنکھوں سے یہ رونق لوٹتے ہیں بازاروں کی

اپنی سنا کیا رینگتا ہے تو اب بھی اُسی کے کوچے میں
میری چھوڑ میں خاک اڑاتا پھرتا ہوں سیاروں کی

اک مدت کے بعد ہلی ہے شہر کی یہ بدمست زمین
ایک ہی جھٹکے میں اکتاہٹ دور ہوئی دیواروں کی

گرم لہو کی بارش بھی اس سرد زمیں پر خوب ہوئی
دھوپ بھی پر کچھ کم تو نہیں تھی لہراتی تلواروں کی

جب تک فکر کے گلشن میں حیرت کے پھول کھلیں گے نہیں
کوکھ رہے گی تب تک خالی یاروں کے فن پاروں کی

۲۲رفروری ۲۰۰۹ء

سائے چپکے ہوئے ہیں اونگھتی دیواروں سے
خوف آتا ہے مجھے راہ کے نظاروں سے

اب بھی طاری ہے کہستاں پہ فقیروں کا سکوت
اب بھی آتی ہے خموشی کی صدا غاروں سے

میں تو اک سلطنت خاک کا شہزادہ ہوں
کام کیا مجھ سے تہی دست کو بازاروں سے

اب نہ ہوتا ہے اندھیرا ہی تری زلفوں سے
اور نہ ہوتی ہے کوئی روشنی رخساروں سے

خواب کی فصل ہی آنکھوں میں اُگا دے کوئی
کاٹے کٹتی ہی نہیں شب ترے بیماروں سے

حیرت آبادِ جہاں کے یہ اجالے ہیں رفیقؔ
رونق آنکھوں میں نہیں شہر کے مہ پاروں سے

۱۵؍مارچ ۲۰۰۹ء

کچھ اس ادا سے وہ منظر پھر آشکارا ہوا
اندھیری رات میں فوارۂ شرارہ ہوا

امید خشک زمیں پر ہی پھر گیا پانی
سیاہ ابر کا پارہ ہی پارہ پارہ ہوا

مرے سکوت سے بوئے زمیں نہیں آتی
کہ یہ سکوت خلاؤں سے ہے اُتارا ہوا

سفر میں اتنی مسافت ہوئی ہے طے مجھ سے
مری نظر میں فلک خود کوئی ستارہ ہوا

ہمارے ہونے کی بجلی گری تھی بس اک بار
یہ حادثہ نہ یہاں پھر کبھی دوبارہ ہوا

چراغ کو بھی اجازت ملی لرزنے کی
ہوا کو رقص بھی کرنے کا اک اشارہ ہوا

یہ کاروبارِ جہاں میرے بس کی بات نہیں
کہ امتیاز برتنے پہ بھی خسارہ ہوا

مرے سکوت میں تجھ سے ہی روشنی تھی کوئی
مرا سکوت بھی تجھ سے ہی استعارہ ہوا

۲۱/مارچ ۲۰۰۹ء

پتے ہلتے بھی نہیں تیز ہوا کے ہوتے
رُک گیا کارِ جہاں کیوں یہ خدا کے ہوتے

خاک پر ایک تذبذب میں ہیں سب اہلِ زمیں
غیر محفوظ ہیں سب سر پہ سما کے ہوتے

شہر خوباں کی سکونت سے کہیں بہتر تھا
ہم مسافر ہی کسی دشت بلا کے ہوتے

آفت آجاتی کوئی شہر رقیباں پر بھی
کوئے جاناں میں بھی دو چار دھماکے ہوتے

ہم کبھی خاک نشیں ہیں کبھی افلاک نشیں
گھر بنایا نہ کبھی ارض و سما کے ہوتے

مجھ تک آئی نہ ترے زلف و بدن کی خوشبو
اور یہ ظلم ہوا بادِ صبا کے ہوتے

لا کی پہنائیوں کی سیر بھی کر سکتے نہیں
بھاگ سکتے بھی نہیں ارض و سما کے ہوتے

دیکھ افلاک کی پر ہول خموشی میں ابھی
فرق آیا نہ کوئی لب پہ دعا کے ہوتے

۲۱/مارچ ۲۰۰۹ء

بحر ذخار سے اس دل کا سراب اچھا ہے
یعنی ہر حال میں یہ خانہ خراب اچھا ہے

اس کا تا دیر اثر ہم پہ رہے گا ہی نہیں
اب کے اترا جو فلک سے وہ عذاب اچھا ہے

جس کی قسمت میں ہے بنتے ہی فنا ہو جانا
اس جہاں میں تو وہی نقش برآب اچھا ہے

زہر موسم کی خبر جس کے مہکنے سے ملے
سارے گلشن میں وہی ایک گلاب اچھا ہے

اب کے ممکن ہے برس جائے زمیں پر بھی مری
گھر کے آیا ہے فلک پر جو سحاب اچھا ہے

آج دیدار کی خواہش بھی نہیں اتنی شدید
آج چہرے پہ بھی تیرے یہ نقاب اچھا ہے

رنگ آنکھوں میں چمکتا ہے اسی کا تا دیر
جو کسی نے بھی نہ دیکھا ہو وہ خواب اچھا ہے

۲۱/ مارچ ۲۰۰۹ء

نظر مرکوز رکھتا ہوں ہمیشہ ہی شرارے پر
نہیں معلوم رقصاں ہوں میں خود کس کے اشارے پر

کیا کچھ صاف مژگاں سے بنا پھر دید کے قابل
جمی تھی گرد کتنے ہی زمانوں کی نظارے پر

پڑے ہیں خاک پر ہم خود عزائم آسماں میں ہیں
فضا میں ہر طرف بکھرے ہوئے ہیں یہ ہمارے پر

روانہ ہو گئے تھے کس طرف وہ پیاس کے مارے
لکھا تھا نام کن صحراؤں کا اس ابر پارے پر

ہوا احساس وحشت کی کمی کا وقت پر مجھکو
ابھی خوش قسمتی سے تھا میں صحرا کے کنارے پر

سفر کیا طے ہو مجھ سے پا شکستہ، آبلہ پا سے
بھروسہ ہے مجھے لیکن تمہارے ہی سہارے پر

ابھی کچھ وصل کے لمحے بھی حاصل ہیں نہیں مجھکو
ابھی یہ کاروبار شوق چلتا ہے خسارے پر

۲۱/مارچ ۲۰۰۹ء

روشن کیے چراغ دعا کا زبان پر
دستک میں دے رہا ہوں درِ آسمان پر

چلتے تھے اور پاؤں سے اڑتی تھی خاک بھی
سایہ عجب سفر میں رہا کاروان پر

اس شہر میں تو بات ہے موسم کی معتبر
دیتا ہے کون دھیان شجر کے بیان پر

اک خانقاہ کیوں نہ ہو تعمیر اس جگہ
سجدے کا اک نشان ملا ہے چٹان پر

آئے یہاں بھی کوئی قیامت بپا کرے
طاری ہے اک سکوت سا دل کے جہان پر

میں اپنے تیردان میں رکھتا ہوں تیر بھی
تو اعتماد کرتا ہے خالی کمان پر

یہ راستہ بھی ہوگیا اب شاہراہِ عام
لاکھوں نشاں ہیں میرے قدم کے نشان پر

رکھتا ہوں اپنے پاس ہی اپنا کلام نغز
بیٹھا ہوں مثلِ مار میں سونے کی کان پر

آزاد جنگلوں میں پھر رہے ہیں آدمی
لی ہے پناہ شیر نے اونچے مچان پر

فی الحال گہری سوچ میں گم ہے رفیقؔ راز
رکھا ہوا قلم بھی ہے فی الحال کان پر

۲۲/مارچ ۲۰۰۹ء

یہ طلاطم خیز دریا کیا سے کیا ہوجائیگا
سانپ میرے ہاتھ میں آکر عصا ہوجائیگا

اور بھی بڑھ جائیں گی خاموشیوں کی ظلمتیں
بے صدا الفاظ کا جنگل گھنا ہوجائیگا

شوق تیرا کچھ دنوں آوارہ کردے گا اسے
خشک پتا آخرش رزقِ ہوا ہوجائیگا

درمیاں میں تو ہی تو ہے تو اگر ہٹ جائے تو
مجھ کو میری ذات کا بھی سامنا ہوجائیگا

صبح تک بھر آئے گی صحرائے دامن کی مراد
قطرہ قطرہ قرض آنکھوں سے ادا ہوجائیگا

اس زمانے میں نہ ہونگے لوگ واقف حسن سے
جس زمانے میں ترا وعدہ وفا ہوجائیگا

۲۸ر مارچ ۲۰۰۹ء

یہ کیسی روشنی رقصاں تھی شب سرِ افلاک
چراغ تھا کہ ستارہ کہ نالۂ بیباک

مرا شکار بھی کر، میں حرم کا صید نہیں
بنا ہی ڈال مجھے بھی تو زینت فتراک

وہ قافلے بھی اسی راستے سے نکلے تھے
وہ قافلے بھی سفر میں ہی ہو گئے تھے ہلاک

ابھی میں اپنے شکاری کا منتظر ہی ہوں
اڑا رہا ہوں ابھی صید گاہ عشق میں خاک

خیال کو تری خوشبو کہیں سے آئی ہے
رواں ہے اب تری جانب یہ توسن چالاک

۲۸ / مارچ ۲۰۰۹ء

دیارِ جسم سے صحرائے جاں تک
اڑوں میں خاک سا آخر کہاں تک

کچھ ایسا ہم کو کرنا چاہیئے اب
اتر آئے زمیں پر آسماں تک

بہت کم فاصلہ اب رہ گیا ہے
بپھرتی آندھیوں سے بادباں تک

میسر آگ ہے گل کی نہ بجلی
اندھیرے میں پڑے ہیں آشیاں تک

یہ جنگل ہے نہایت ہی پراسرار
قدم رکھتی نہیں اس میں خزاں تک

وہیں تک کیوں رسائی ہے ہماری
نقوشِ پا زمیں پر ہیں جہاں تک

نکل آؤ حصارِ خامشی سے
جو دل میں ہے وہ لاؤ بھی زباں تک

یہاں شیطاں پہ ہے اک لرزہ طاری
نہیں اٹھتا چراغوں سے دھواں تک

۹/اپریل ۲۰۰۹ء

شجر کچھ ہو گئے تھے خود بخود نغمہ سرا سے
کبھی ہوتے ہیں ایسے معجزے ہلکی ہوا سے

ہوئے ہیں سوچ ہی کے زاویے تبدیل اتنے
دہل اٹھتی ہے بستی رات کو آواز پا سے

جسے خود ایک ہی جھٹکے میں گرنا ہے اچانک
وہی دیوار اب سائے کو دیتی ہے دلاسے

حصارِ حرف سے آزاد بھی ہوں اور نہیں بھی
مجھے رکھا ہے اس نے التوا میں ابتدا سے

لگی ہے آگ اپنے ہی چراغوں سے مکاں میں
میں اندر سے منور ہوں تو اپنی ہی انا سے

چمکتی ہے جو ان تپتے ہوئے ہونٹوں پہ میرے
بڑی مشکل سے لایا ہوں یہ خاموشی خلا سے

۱۰/اپریل ۲۰۰۹ء

مجھ پر تو بے اثر ہے یہ شدت سراب کی
رکھتا ہوں اپنے پاس میں تصویر آب کی

اس رات کے کنارے پہ اک اور رات ہے
رکھنا بچا کے روشنی آنکھوں میں خواب کی

کس سر زمینِ روح کا درپیش ہے سفر
سایہ یہاں ہے آگ کا، دیوار آب کی

مجھ سے یہ آج بھی نہیں کھلتا کسی طرح
کہنے کو بس کہانی ہے اتنی ہی باب کی

شاخوں پہ جس کے شعلے ہیں پھل پھول کی طرح
بیٹھا ہوا ہوں چھاؤں میں اُس نخل آب کی

کھاتی ہے اتنا خوف شب ہجر مجھ سے کیوں
آنکھوں میں میری دھوپ ہے کس آفتاب کی

دکھلا دے خواب پھر اسی ویراں مکان کے
کردے خراب نیند بھی خانہ خراب کی

چلنے لگی ہے دشت میں پھر باغ کی ہوا
آنے لگی ہے پھر کوئی خوشبو گلاب کی

۱۰/اپریل ۲۰۰۹ء

روشن بہت سحر ہے ترے روئے ناز کی
تھوڑی سی شام چاہیئے زلف دراز کی

سجدوں کے داغ تازہ ہیں بوسیدہ کمروں میں
دیوار و در سے آتی ہے خوشبو نماز کی

برپا ہوئی تھی کس جگہ وہ محفل طلسم
ہے نقش کس چٹان پہ آواز ساز کی

طوفان کے مزاج سے واقف بھی کم ہی تھا
قسمت بھی کچھ خراب ہی تھی اس جہاز کی

ہوگا پھلوں کا ذایقہ اس سال مختلف
پیڑوں نے موسموں سے کوئی ساز باز کی

منظر فنا کی راہ میں پھر سے ہیں گام زن
یعنی بھنور نے چشم سیہ پھر سے باز کی

ترتیب دے رہا ہوں میں الفاظ کو نئی
محفوظ کر رہا ہوں کوئی بات راز کی

۱۴/اپریل ۲۰۰۹ء

دل میں تو ہے ہوس بھی بہت آسمان کی
آنکھوں میں خاک بھی ہے زمین و زمان کی

ڈر ہے پگھل نہ جائے کہیں برف کی طرح
اب بھی ہے تیز دھوپ میں وہ میرے دھیان کی

کچھ اخترِ یقیں کا اجالا فضا میں تھا
کچھ منتشر تھی خاک بھی وہم و گمان کی

دل میں تڑپ ہے چشمۂ زیرِ زمیں کی سی
لب پر مگر ہے خامشی گہری چٹان کی

لائی ہے رنگ خاک نشینی مری یہ کیا
خوشبو مکان میں ہے مرے لامکان کی

یہ جا تو دیکھ کتنی لہو سے ہے سرخرو
اس جا کوئی جگہ نہیں امن و امان کی

خطرہ دہانِ شیر میں گرنے کا ہے بہت
دن رات کر رہا ہوں حفاظت مچان کی

مجھکو بھی راہ عشق میں ٹھوکر ہی لگ گئی
روشن رکھی تھی میں نے بھی مشعل گمان کی

۱۴/۱/اپریل ۲۰۰۹ء

کم تھا یقین اور زیادہ گماں ہی تھا
دریا سا دشت دل میں سراب رواں ہی تھا

لگتا تھا ایک عرصے سے سویا نہیں تھا وہ
آنکھوں میں اس کی برسوں پرانا سماں ہی تھا

یا تو یہ راہ عشق ہی پرخار تھی بہت
یا بارِ عشق شانوں پہ تیرے گراں ہی تھا

ارزاں تھی چھاؤں جب تری زلف دراز کی
اس دور میں بھی سر پہ مرے آسماں ہی تھا

وہ شعلہ شعلہ منظر امکاں نہ تھا کہیں
اہل نظر کے سامنے خالی دھواں ہی تھا

مہر و نجوم اس کا نہ کرتے طواف کیوں
وہ ماہ رو تو کعبۂ سیارگاں ہی تھا

چھوڑا اگر مکیں نے اسے کیا برا کیا
بوسیدہ کچھ زیادہ یہ دل کا مکاں ہی تھا

شاخوں پہ جسکی آندھیاں مصلوب ہوگئیں
وہ پیڑ سن رسیدہ نہیں تھا جواں ہی تھا

۱۷/اپریل ۲۰۰۹ء

وہ اژدھا تو عصا بنا بھی مرے لئے تھا
بنا جو اس سے وہ راستہ بھی مرے لئے تھا

وہ جس کا عکس نشاں زمیں پر ہے نقش اب تک
وہ سایہ گرتے درخت کا بھی مرے لئے تھا

لرز رہا ہے مری ہی سانسوں سے جو دیا سا
دیار ہو میں یہ گل کھلا بھی مرے لئے تھا

وہ جس کے اٹھنے کی تاب آنکھیں نہ لاسکی تھیں
وہ پردۂ غیب تو اٹھا بھی مرے لئے تھا

الگ ہی سنگیت کے بھی چشمے ابل رہے تھے
سکوت دل کا غزل سرا بھی مرے لئے تھا

اک آشنائی سی مجھ کو بھی تجھ سے ہو رہی تھی
کہ چھا رہا موسم جفا بھی مرے لئے تھا

نہ صرف اس نے مرے اشارے کی لاج رکھ دی
پہاڑ رستے سے ہٹ گیا بھی مرے لئے تھا

۱۸/اپریل ۲۰۰۹ء

اُجالا رات کو بیرون زندان ہوگیا ہوگا
فقط یہ رخنۂ دیوار حیراں ہوگیا ہوگا

پریشاں ہوگیا ہوگا غبارِ راہ تو لیکن
نقوشِ پا سے ویرانہ خیاباں ہوگیا ہوگا

مرے باہر اندھیرا یہ جو کچھ سہما ہوا سا ہے
مرے اندر کا سناٹا فروزاں ہوگیا ہوگا

فضائے شہر کی پہنائیوں سے خوف آتا ہے
اٹھا تھا جو دھواں دل سے پریشاں ہوگیا ہوگا

نظر اس نے تو مڑ کر ڈالی ہوگی میری دنیا پر
یہاں جو کچھ نہیں وہ بھی نمایاں ہوگیا ہوگا

شرار شوق آنکھوں میں تری جب تک بنے شعلہ
مرے ہونے کا بھی پیدا کچھ امکاں ہوگیا ہوگا

بہار آئی ہوئی ہے فصلِ وحشت پر، پریشاں ہوں
مرے محبوب کا کوچہ بیاباں ہوگیا ہوگا

۲۵/اپریل ۲۰۰۹ء

یہاں کوئی نہیں تنہائیوں سے خوف آتا ہے
درونِ ذات کی پہنائیوں سے خوف آتا ہے

صداؤں کے سمندر انکی مٹھی میں تڑپتے ہیں
سکوت کوہ کے شیدائیوں سے خوف آتا ہے

لرزتا کیوں ہوں، مثلِ شمع تو روشن نہیں ہوں میں
مجھے کیوں بے سبب پروائیوں سے خوف آتا ہے

میں جگنو ہوں کہیں مجھ سے یہ جنگل ہی نہ جل جائے
ہوا کی حوصلہ افزائیوں سے خوف آتا ہے

نہیں موجود اس بستی میں کوئی بھی کنواں پھر بھی
بھرے بازار میں کیوں بھائیوں سے خوف آتا ہے

میں رہتا یوں تو ہوں کشمیر کے بارود خانہ میں
مگر گجرات کے بلوائیوں سے خوف آتا ہے

مجھے شکوہ نہیں آوارہ گردی سے ہواؤں کی
سکوت دشت میں شہنائیوں سے خوف آتا ہے

۲۵/اپریل ۲۰۰۹ء

نہیں سکوت میں یونہی چمک دمک اس کی
ہزار رنگ کی مجھ میں ہے اک دھنک اس کی

میں بے مکاں ہوں تہی دست تو نہیں، یعنی
صبا کی طرح لئے پھرتا ہوں مہک اس کی

لرز اٹھا نہ کوئی برگ جھڑنے سے پہلے
سنائی دی نہ کسی کو بھی چاپ تک اس کی

کبھی اٹھے گی مری بھی جھکی ہوئی یہ نظر
دکھائی دے گی مجھے بھی کبھی جھلک اس کی

عصا کی ضرب سے دریا کا دل دہل تو گیا
ہوئی نہیں ہے نمودار پر سڑک اس کی

۲؍مئی ۲۰۰۹ء

آنکھوں کے آسماں پر اک مہر سا ہے تاباں
اک خواب سے ہے روشن تاریک شام ہجراں

روشن ہیں شہرِ شب میں چشمان خرقہ پوشاں
تیری عنایتوں سے پرنور ہے بیاباں

سہمی ہوئی فضا میں پھیلی ہوئی ہے خوشبو
شہر سخن وراں میں خاموشیاں ہیں رقصاں

جس کا طواف کرنے اتری ہوا فلک سے
وہ شعلۂ گل تر کس شاخ پر ہے لرزاں

تیری چمک دمک بھی موجود تھی یقیناً
کچھ استعارے بھی تھے اشعار میں فروزاں

۲رمئی ۲۰۰۹ء

زیرِ قدم نواحِ زمینِ وطن تو آئے
رم بھی کروں گا پہلے وہ دشتِ ختن تو آئے

تجھ کو تری ہی آگ سے روشن کروں گا میں
دستِ کمال میں مرے تیرا بدن تو آئے

آئے نہ آئے منزلِ مقصود، کم سے کم
رستے میں سر پہ سایۂ سرو و سمن تو آئے

دھنتا رہوں گا سر بھی قفس میں مثالِ شمع
لیکن کہیں سے موجِ ہوائے چمن تو آئے

کرنے تو دو عبور یہ صحرا سکوت کا
کھولوں گا میں زبان بھی شہرِ سخن تو آئے

تپتی ہوئی زمین پہ سایا ابھی کہاں
عریاں شجر کے تن پہ نیا پیرہن تو آئے

سر کو جھکانے میں ہمیں کیا اعتراض ہے
شمشیر ہاتھ میں لئے شمشیر زن تو آئے

۹ر مئی ۲۰۰۹ء

آنکھ حیراں ہے کہ یہ منظر نہ تھا دیکھا ہوا
ریت پر گرتے ہی قطرہ اشک کا دریا ہوا

ٹوٹ جائے گی تری خاموشی اے تالاب کب
کب تڑپ اٹھے گا یہ پانی ترا ٹھہرا ہوا

کچھ فقیرانِ زمیں، گرم سفر صحرا میں ہیں
اور خلا میں ہے غبار لامکاں اڑتا ہوا

ہم بہت پیاسے ہیں اور ساحل کے بھی نزدیک ہیں
شور کرتا ہے بہت پانی یہ کیوں بہتا ہوا

کیا فلک کی رحمتوں کو ہے برسنا آج ہی
آج کیوں یہ دامن صحرا بھی ہے پھیلا ہوا

یا تری یادوں کی خوشبو سوچ کے صحرا میں ہے
یا بیاباں میں کہیں اک باغ ہے مہکا ہوا

۲۳ / اگست ۲۰۰۹ء

یہ دن کی روشنی میں بھی چمکتا رہتا ہے
ترا بدن تو زمیں کا کوئی ستارہ ہے

نیا ہی قافلہ شاید یہاں سے گزرا ہے
یہ ابر ہے کہ فلک پر غبارِ صحرا ہے

یہاں تو سایۂ دیوار میں ہیں مست سبھی
یہاں نوشتۂ دیوار کون پڑھتا ہے

صدائے آب مسلسل یہیں سے آتی ہے
یہیں پہ قید چٹانوں میں کوئی جھرنا ہے

گئے وہ لوگ سنا کے حکایت مجنوں
اب آنگنوں میں ہمارے سکوت صحرا ہے

چراغ لعل و گہر سے دھواں نہیں اٹھتا
اتر کے دیکھ کہ روشن یہ قعردریا ہے

کبھی اٹھی ہے تری بھی نگاہ میری طرف ؟
کبھی یہ منظر بے منظری بھی دیکھا ہے ؟

۱۹/ستمبر۲۰۰۹ء

تمام روئے زمیں پر سکوت چھایا تھا
نزول، کیسی قیامت کا ہونے والا تھا

یہاں تو آگ اگلتی ہے یہ زمیں ہر سو
وہ ایک ابر کا پارہ کہاں پہ برسا تھا

بس ایک بار ہوا تھا وجود کا احساس
بس ایک بار دریچے سے اس نے جھانکا تھا

ابھی ڈسا نہ گیا تھا یہ جسم تپتا ہوا
ابھی خزینۂ مخفی پہ سانپ سویا تھا

سفر میں سر پہ تری دھن تو تھی سوار مگر
نگاہ میں کوئی منزل نہ کوئی رستہ تھا

یہ قطرہ بحرِ معانی ہے موجزن جس میں
قلم کی نوک سے پہلے کبھی نہ ٹپکا تھا

۱۹ر ستمبر ۲۰۰۹ء

یہ سنگ و خشت سے جو آئینے بناتا ہوں
یہ سب میں اہل نظر کیلئے بناتا ہوں

بروئے کار لہو کو بھی اپنے لاتا ہوں
زمین خشک پہ منظر نئے بناتا ہوں

پناہ تابش افکار سے کہیں تو ملے
حروف سبز کے جنگل گھنے بناتا ہوں

بھٹک رہا ہوں نہیں یوں ہی میں بیاباں میں
میں قافلوں کیلئے راستے بناتا ہوں

یہ ریگ زار تو کاغذ پہ نامکمل تھا
ندی فرات کی اب خون سے بناتا ہوں

بھٹک نہ جائیں کہیں قافلے جو پیچھے ہیں
نشان راہ بہت سوچ کے بناتا ہوں

یہ کائینات ہی کچھ مختلف نظر آئے
نگاہ کے میں الگ زاویے بناتا ہوں

۱۹ر ستمبر ۲۰۰۹ء

بھیانک عکس تھے ان آئینوں میں
جنہیں ہم توڑ آئے راستوں میں

مکاں تو ہو چکا ہے راکھ جل کر
چھڑی ہے جنگ کس پر وارثوں میں

اجالا کم ہی بس امکان بھر تھا
زیادہ آگ تھی ان بجلیوں میں

یہ کن کے نقش پا روشن ہیں اتنے
یہ کیسی روشنی ہے جنگلوں میں

سفر ان کیلئے کرتی ہے منزل
نظر آتے نہیں جو قافلوں میں

یہ گھر ہوتے ہیں بے دیوار و در جو
یہ کیوں گرتے نہیں ہیں زلزلوں میں

۲۰ ستمبر ۲۰۰۹ء

روشنی میں یہ دل رہا ہے بہت
اس جگہ سے دھواں اٹھا ہے بہت

کیا ہوا وہ ہجوم نالہ کشاں
شہر کیوں آج بے صدا ہے بہت

سرخ روئی پہ اپنی ناز نہ کر
تونے لوگوں کا خوں پیا ہے بہت

دھوپ اتنی کڑی نہیں لیکن
سایہ دیوار کا گھنا ہے بہت

شہر دل کی اداس گلیوں میں
شور کیسا یہ جا بجا ہے بہت

شمع حیرت ہو آنکھ کی روشن
اب اندھیرا تو بڑھ چکا ہے بہت

نکل آئے گا راستہ کوئی
دست روشن میں اک عصا ہے بہت

۲۷ستمبر۲۰۰۹ء

نہ ہوا کچھ بھلا دعا سے بھی
اس کے در پر گیا انا سے بھی

یہ سکوت سیاہ اب روشن
نہیں ہوگا تری صدا سے بھی

سر سے گزری تھی موج آب کوئی
ہم کہ خاموش بھی تھے پیاسے بھی

وہ روایت پسند ہی نکلا
باز آیا نہ وہ جفا سے بھی

شمع ہوں پر لرز بھی اٹھتا ہوں
گفتگو ہے مری ہوا سے بھی

ذرۂ خاک ہوں ستارہ سا
میرا رشتہ ہے کچھ خلا سے بھی

۱/اکتوبر۲۰۰۹ء

کیا خبر سچ ہے اُس کے آنے کی
رک گئی سانس کیوں زمانے کی

ظلمت زلف کا مقام آیا
اب ضرورت ہے دل جلانے کی

رات گہری ہوئی تو کوچے میں
بوند بھر روشنی صدا نے کی

لب پہ ہے وِرد اسم اعظم کا
کنجیاں ساتھ ہیں خزانے کی

دل میں اک قطرۂ سکوت سے ہے
ساری مستی شراب خانے کی

دل میں کچھ نقش روشنی کے ہیں
یہ جو کچھ داغ ہیں اسی کے ہیں

ہلکی آہٹ سے کیوں لرزتے ہیں
یہ دیئے کیا سکوت ہی کے ہیں

داستانوں میں ذکر ہے جس کا
ہم بھی عاشق اسی پری کے ہیں

ہم کو صحراؤں کے سفر سے کیا
ہم گداگر تو اک گلی کے ہیں

ہاں کبھی ایک ہی بھنور میں تھے
دو کنارے ہم اب ندی کے ہیں

عہد حاظر کے یوں تو ہیں الفاظ
پر خیالات کس صدی کے ہیں

میرے شعروں میں کیوں نہیں روشن
وہ مسائل جو ہم سبھی کے ہیں

۱/۱اکتوبر۲۰۰۹ء

نہ پوچھ وہ شجر سایہ دار کیوں تھا عجب
اسے تو تیز ہواؤں میں بھی سکوں تھا عجب

کبھی نوشتۂ دیوار پڑھ نہ پایا میں
اس ایک سایۂ دیوار کا فسوں تھا عجب

زمین پاؤں تلے سے نکل گئی تھی مگر
سروں پہ سایہ کیے چرخ نیلگوں تھا عجب

تمہارے قرب کی خواہش میں خود سے دور ہوئے
مسافران بیاباں کا بھی جنوں تھا عجب

اسی کے دم سے ابھی ہے زمینِ دِل سیراب
گرا جو تپتی ہوئی ریت پر وہ خوں تھا عجب

۲۳/اکتوبر ۲۰۰۹ء

چاندنی رات میں اک بار اسے دیکھا تھا
چاند سے برسرِ پیکار اسے دیکھا تھا

مثلِ خورشید نمودار وہ اب تک نہ ہوا
آخری بار سر غار اسے دیکھا تھا

میں بھلا کیسے بیاں کرتا سراپا اس کا
شب یلدا پسِ دیوار اسے دیکھا تھا

دل میں اتری ہی نہ تھی روشنی اس منظر کی
اولیں بار تو بے کار اسے دیکھا تھا

لوگ کیوں کوہ و بیاباں میں اسے ڈھونڈتے ہیں
میں نے تو برسربازار اسے دیکھا تھا

اس نے کیا رات کو دیکھا تھا یہ معلوم نہیں
میں نے تو نقش بہ دیوار اسے دیکھا تھا

اس کی آنکھوں میں چمک خواب کی یہ کیسی ہے
رات بھر چرخ نے بیدار اسے دیکھا تھا

۴/اکتوبر۲۰۰۹ء

وہ تاب و تب تو کسی آفتاب میں بھی نہ تھی
ستم یہ اس پہ سحر تک حجاب میں بھی نہ تھی

جو بات گل کی خموشی میں ہم نے پائی ہے
وہ ایک بات صبا کے خطاب میں بھی نہ تھی

اِک آب جو تھی بدن کے سراب میں ایسی
کہ موج زن بھی نہ تھی اضطراب میں بھی نہ تھی

بہا کے لے گئی جو بن صدا کئے ہی مجھے
وہ موج آب تمہارے سراب میں بھی نہ تھی

اداس جتنی زمیں آج بارشوں میں ہے
اداس اتنی کبھی قحطِ آب میں بھی نہ تھی

اتارتا میں تمہیں کینوس پہ کیسے بھلا
تری مثال خیال اور خواب میں بھی نہ تھی

وہ پرسکون بھی مجھ بن نہ تھی یہ سچ ہے مگر
مری طرح وہ مسلسل عذاب میں بھی نہ تھی

۴/اکتوبر ۲۰۰۹ء

آگ گھر کو ہے لگی اور مکیں ہے تہہ آب
یعنی اک گریہ کناں گوشہ نشیں ہے تہہ آب

سر ساحل تو پتہ تجھ کو نہیں ملنے کی
سوچتا کیا ہے؟ اتر، حسن حسین ہے تہہ آب

اب کسی موج گماں کا کوئی خطرہ ہی نہیں
اب تروتازہ بہت فصل یقیں ہے تہہ آب

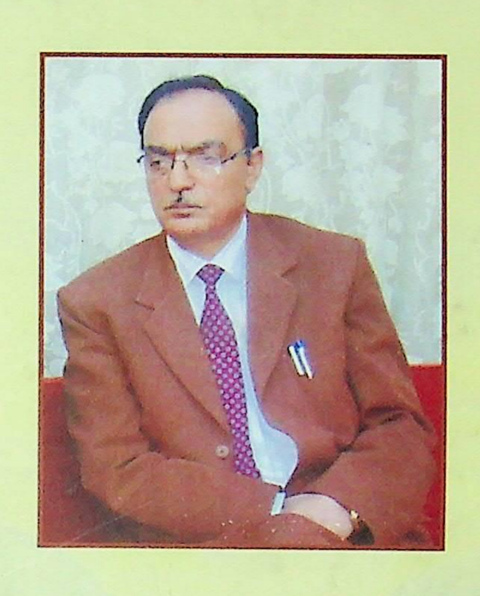
جانے کس خاکِ بیاباں سے ہے نسبت اسکو
خشک اب بھی یہ مرے دل کی زمیں ہے تہہ آب

رقص کرتے ہیں بصد شوق شرارے یہ جہاں
ایک فوارۂ آتش بھی وہیں ہے تہہ آب

۴ر اکتوبر ۲۰۰۹ء

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ رفیق راز
کی تقریباً ہر غزل میں کوئی نہ کوئی حمد یا نعت کا شعر
ضرور ہوتا ہے۔ بعض اشعار کی پیچیدہ بیانی انہیں
جدیدیت کا اہم شاعر قرار دیتی ہے اور انہوں نے
ردائف وقوافی اور بحور و اوزان کے اعتبار سے جو
تجربات کیے ہیں، ان کی روشنی میں مابعد جدیدیت
کے پرستار اپنی صف میں انہیں بہت اہم مابعد جدید
شاعر کا مقام عطا کریں گے۔ لیکن میرے نزدیک
رفیق راز وہ شاعر ہے جس کی شاعری کسی بھی تحریک
یا رجحان کے نظریات میں مقید نہیں کی جا سکتی۔ ہاں
ان کی شاعری کے مختلف رخوں کو ایک مختلف ادبی
تحریکات و رجحانات کی روشنی میں ضرور دیکھا جا
سکتا ہے۔ رفیق راز کی ان تمام تخلیقی خصوصیات کی
بنا پر میں انہیں عہد حاضر کا نمائندہ غزل گو شاعر تسلیم
کرتا ہوں۔ دلیل کے طور پر ''مشراق'' حاضر ہے۔

میکش امروہوی
جنرل سکریٹری انڈین کلچرل سوسائٹی
(نئی دہلی)



رفیق راز نے اپنی شاعری میں جو تجربات کیے ہیں ان میں بحور واوزان کے تجربات حیران کن حد تک اپنی جانب توجہ مبذول کراتے ہیں۔ دور حاضر جو کہ سہل پسندی کا دور ہے اور بیشتر اہم شعرا بھی آج کل چند مخصوص بحور واوزان سے کام چلا رہے ہیں، ایسے میں رفیق راز کا یہ عمل بہت مستحسن ہے اور مشعل راہ بھی۔ ان تجربات میں انھوں نے جن موضوعات کو شعری اسلوب عطا کیا ہے، ان میں بھی آورد کا دخل تقریباً نہ کے برابر ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شعر ڈھلی ڈھلائی صورت میں انہیں بحور واوزان میں ان کی تخلیقی حسیت پہ وارد ہوتا ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب شاعر اپنی ذاتی فطرت کو شعری فطرت میں ضم کر دے۔ یعنی اس کا تصور جب پرواز کرتا ہے تو ظاہری اور باطنی ہر طور ذاتی فطرت پر شعری فطرت کا غلبہ ہو جاتا ہے اور پھر جو کچھ بھی تخلیقی عمل ہوتا ہے وہ رفیق راز کی شاعرانہ انفرادیت کا مدلل ثبوت ہوتا ہے۔ ''مشراق'' کے مطالعے میں شعری فطرت کی اس لذت کو بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس لذت نے الفاظ کا جامہ پہن کر شعری پیکروں میں ڈھل کر لامحدود معنوی کائنات کے ان گوشوں کا سراغ لگایا ہے جو رفیق راز کو اس عہد کا ایسا شاعر تسلیم کرانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں جن کی شاعری آنے والے کتنے ہی زمانوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہو سکتی ہے۔

عادل بنارسی